كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿ص : ٢٩﴾

تدبر قرآن

تفسیر سورۃ القیامۃ و سورہ الانسان

امین احسن اصلاحی

www.facebook.com/payamequran

پیامِ قرآن کی پیش کش

تدبّرِ قرآن

تفسیر سورہ القیامۃ و سورہ الانسان

امین احسن اصلاحی

بسم الله الرحمن الرحيم

القیامۃ

((THE DAY OF RESURRECTION, RISING OF THE DEAD))

40 آیات | مکیّ

سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ بھی، گروپ کی سابق سورتوں کی طرح، انذار قیامت کی سورہ ہے۔سابق سورہ کا خاتمہ اس مضمون پر ہوا ہے کہ اس یاددہانی سے اعراض کرنے والوں کے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا جو شعور اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمایا ہے یہ سر گشتگان دنیا اس کو ضائع کر بیٹھے ہیں۔سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو زندہ رکھتے ہیں ان کو مزید ہدایت و روشنی نصیب ہوتی ہے اور جو اس کو ضائع کر بیٹھتے ہیں وہ ایسے اندھے بہرے بن جاتے ہیں کہ ان پر کوئی تذکیر بھی کارگر نہیں ہوتی۔

اس سورہ میں اسی حقیقت کو اچھی طرح مبرہن کر دینے کے لیے نفس لوامہ کی، جو ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور اس کو قیامت کے ثبوت میں ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔یہ انسان کے اندر ایک مخفی زاجر کی حیثیت رکھتا ہے جو اس کو، جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے، ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔انسان کے اندر اس کا پایا جانا نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ اس دنیا میں مطلق العنان اور غیر مسؤل بنا کر نہیں چھوڑا گیا کہ چاہے وہ نیکی کرے یا بدی اس کے خالق کو اس سے کچھ بحث نہ ہو۔اگر ایسا ہوتا تو اس کے اندر اس طرح کے کسی زاجر کو بٹھانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔انسان ایک عالم اصغر ہے اس کے اندر نفس لوامہ کا پایا جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس عالم اکبر کے اندر بھی ایک نفس لوامہ ہے جس کو قیامت کہتے ہیں۔وہ ایک دن ظہور میں آئے گی اور ان تمام لوگوں کو ان کی بداعمالیوں پر سرزنش کرے گی جنھوں نے اپنے اندر کے مخفی زاجر کی تنبیہات کی پروا نہ کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کی عدالت کبریٰ کا ایک عکس ہر انسان کے اپنے وجود کے اندر نفس لوامہ کی عدالت صغریٰ کی شکل میں موجود ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص کوئی برائی کرتا ہے وہ کہیں پس پردہ نہیں کرتا بلکہ خدا کی عدالت کے دروازے پر اور اس کے مقرر کیے ہوئے کوتوال کے روبرو کرتا ہے۔ چنانچہ نفس لوامہ کی شہادت پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ 'بَلْ يُرِيْدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ' (5) (بلکہ انسان اپنے ضمیر کے روبرو شرارت کرنا چاہتا ہے)۔اسی حقیقت کی وضاحت آگے کی آیات میں یوں فرمائی ہے کہ 'بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيْرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيْرَهُ' (14-15) (بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے اگرچہ وہ کتنے ہی عذرات تراشے)۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جدید فلسفۂ اخلاق کے ماہروں نے بھی چند بنیادی نیکیوں کا نیکی ہونا اور چند معروف برائیوں کا برائی ہونا بطور اصول موضوعہ تسلیم کر کے اپنی بحث کا آغاز کیا ہے۔اگرچہ وہ یہ نہیں بتا سکے کہ ان نیکیوں کا نیکی یا ان برائیوں کا برائی ہونا انھوں نے کہاں سے جانا جس کے سبب سے ان کی ساری عمارت بے بنیاد رہ گئی ہے لیکن یہ حقیقت انھیں تسلیم ہے کہ بنیادی نیکیوں اور بنیادی برائیوں کے شعور سے انسان محروم نہیں ہے۔قرآن نے اس سورہ میں اس حقیقت سے یوں پردہ اٹھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ صرف نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرمایا ہے بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (ضمیر) بھی رکھا ہے جو برائیوں کے ارتکاب پر اس کو سرزنش کرتا اور نیکیوں پر اس کو شاباش دیتا ہے اور پھر اسی نفسیاتی حقیقت پر اس نے قیامت اور جزا و سزا کی دلیل قائم کی ہے کہ جس فاطر نے ہر انسان کے نفس کے اندر اس کی بد عملی پر سرزنش اور اس کی نیکی پر تحسین کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس مجموعی کائنات کے لیے کوئی ایسا دن نہ لائے جس میں اس پوری دنیا کا محاسبہ ہو اور ہر شخص اپنی نیکیوں کا صلہ اور اپنی بدیوں کی سزا پائے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(1-6) قیامت کی قسم خود قیامت کی قطعیت پر اور انسان کے اندر نفس لوامہ کے وجود سے قیامت کے حق میں ایک نفسیاتی شہادت اور اس حقیقت کا انکشاف کہ جو منکرین اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرکھپ اور گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ممکن نہیں ہے، ان کا یہ خیال خود ان کے اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف ہے۔ان کی مثال اس بے باک چور کی ہے جو کوتوال کے سامنے چوری کرتا ہے۔

(7-15) قیامت کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب کہ آج تو یہ ایک بدیہی حقیقت کو جھٹلانے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن جب اس کی ہولناک ہلچل برپا ہو گی تو کہیں گے کہ اب کہاں بھاگیں! حالانکہ اس وقت کسی کے لیے خدا کے سوا کوئی اور ٹھکانا نہیں ہو گا۔ ہر ایک سے اس دن اس کے ایک ایک عمل کی بابت پرسش ہونی ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان سے مخفی نہیں ہے اگرچہ وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے کتنی ہی سخن سازیاں کریں۔

(16-19) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جلد بازی سے اجتناب کی ہدایت اور صبر کی تلقین کہ مخالفین خواہ کتنی ہی جلدی مچائیں لیکن تم ان سے متاثر ہو کر قرآن کے اتارے جانے کے لیے جلدی نہ کرو بلکہ جس رفتار سے یہ اتر رہا ہے اس کو اطمینان سے اخذ کرو اور لوگوں تک اس کو پہنچاؤ۔اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حکمت و مصلحت کے تحت نازل فرما رہا ہے اور اس کے جمع و ترتیب، حفاظت و صیانت اور اس کی توضیح و تبیین ہر چیز کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لی ہے۔ان معاملات میں کسی پہلو سے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

(20-25) منکرین قیامت کو ملامت کہ تمہاری یہ ساری سخن سازیاں کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں۔تم جو کچھ کہہ رہے ہو خود اپنے ضمیر کے خلاف محض اس وجہ سے کہہ رہے ہو کہ تم اس دنیا کا عشق رکھتے ہو اور آخرت کو نظرانداز کر رہے ہو حالانکہ آخرت ایک حقیقت ہے۔اس دن بہت سے چہرے شاداب اور اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں گے اور بہتوں کے چہرے بگڑے ہوئے ہوئے اور وہ یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمرتوڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنی ہے۔

(26-40) کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے گا۔ہر ایک کو موت کی جان کنی سے سابقہ پیش آنا ہے اور اسی بے بسی و بے کسی کے حال میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔بدقسمت ہے وہ جس نے نہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا نہ نماز پڑھی بلکہ جب اس کو یاددہانی کی گئی تو نہایت رعونت سے منہ موڑ کر اپنے لوگوں میں چل دیا۔ہر شخص کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس خدا نے انسان کو منی کے ایک قطرہ سے وجود بخشا اور اس کا تسویہ کر کے گوناگوں صفات سے اس کو آراستہ کیا اس کے لیے اس کے مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں روز محشر کی۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

قسم سے پہلے 'لا' کے استعمال کی نوعیت: عربیت کے اس اسلوب کی وضاحت ایک سے زیادہ مقامات میں ہو چکی ہے کہ قسم سے پہلے جب اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے جس طرح یہاں ہے تو وہ قسم کی نفی کے لیے نہیں بلکہ مخاطب کے اس خیال کی نفی کے لیے آتا ہے جس کی تردید اس قسم سے مقصود ہوتی ہے! اس کی مثالیں جس طرح عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں اسی طرح ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ آپ جس کسی شخص کی بات کی فوری تردید کرنی چاہتے ہیں تو کہتے ہیں: نہیں، خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے۔ اس اسلوب قسم سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ متکلم کے نزدیک مخاطب کی بات اتنی لغو ہے کہ وہ اس کی تردید میں اتنے توقف کا بھی روادار نہیں کہ قسم کے بعد اس کی تردید کرے بلکہ اس سے پہلے ہی اس کی تردید بلکہ اپنی بیزاری کا اظہار ضروری سمجھتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس 'لا' کو زائد اور بعضوں نے اس کو فعل سے متصل مانا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ ہم نے جگہ جگہ اس کتاب میں اس کی تردید کی ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر سورۂ قیامہ میں اس پر وضاحت سے بحث کی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس کی مراجعت فرمائیے۔

یہاں قسم کا مقسم علیہ مذکور نہیں ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

مقسم علیہ کے حذف کی بلاغت: ایک یہ کہ یہاں مقسم علیہ اتنا واضح ہے کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا قسم خود اپنے مقسم علیہ پر دلیل ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ سورۂ قٓ اور سورۂ صٓ میں 'وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ' اور 'وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ' کی قسمیں بھی اسی طرح مقسم علیہ کے بغیر آئی ہیں۔ اس طرح کی قسموں سے مقصود مخاطب پر یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی تردید یا تکذیب کر رہا ہے وہ خود اپنی صداقت پر ایسی شاہد عدل ہے کہ اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد 'نفس لوامہ' کی جو قسم ہے وہ قیامت کے حق ہونے پر ایسی بدیہی دلیل ہے کہ اس کی تکذیب، جیسا کہ آگے وضاحت آئے گی، آدمی کے خود اپنے قلب و ضمیر کی تکذیب کے ہم معنی ہے۔ اس شہادت کے ہوتے قیامت کسی دلیل کی محتاج نہیں رہ جاتی بلکہ وہ بجائے خود دعویٰ اور دلیل قسم اور مقسم علیہ دونوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾

اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

نفسِ لوّامہ کی شہادت قیامت پر: یہ دوسری قسم ہے اور اس کا مقسم علیہ بھی مذکور نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقسم علیہ خود قسم کے اندر ہی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر نفس لوامہ کا وجود شاہد ہے کہ قیامت حق ہے۔ گویا اس دوسری قسم نے قسم ہی کے پیرایہ میں دعوے اور دلیل دونوں کی وضاحت کر دی اور اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ قیامت کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا عکس ہر انسان کے اپنے باطن کے اندر موجود ہے اور وہ اس کو دیکھتا بھی ہے اگرچہ اس کی تردید میں کتنی ہی دلیل بازیاں کرے۔

نفس لوامہ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفس انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالی نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی دونوں کا شعور ودیعت فرمایا ہے اور اس کی سعادت و شقاوت کے لئے ضابطہ یہ

ٹھہرایاہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا بنے گا اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہو گا۔ سورہ شمس میں اس بات کی طرف یوں اشارہ فرمایاہے:۔

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۔فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۔قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۔وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا – الشمس:۷-۱۰

اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل۔ پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا وہ نامراد ہوا۔

اپنی تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نفس کے اس پہلو کی طرف یوں اشارہ فرمایاہے:

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ–یوسف:۵۳

اور میں اپنے نفس کو بری ہیں ٹھہراتا۔ نفس بڑا ہی برائی کی راہ سجھانے والا ہے۔

لیکن یہ نفس نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی، اگر اس سے کوئی برائی صادر ہو جاتی ہے، ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفس لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توازن کو قائم رکھنے کی تدبیر: نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالی نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روز جزاءوسزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی اہے اور وہ کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفس لوامہ کو فوراً ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ وانابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایاہے۔ تربیت نفس کا سب

سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ سے جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں "راضیۃ مرضیۃ" کا مقام حاصل ہو گا جو نفس انسانی کی معراج ہے۔

بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے: اس تفصیل سے واضح ہوا کہ بدی کے بدی ہونے کا شعور انسان کی فطرت کے اندر روز اول سے ودیعت ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے حسد سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن قتل کر دینے کے بعد اس کی لاش کو چھپانے کی بھی کوشش کی۔ یہ کوشش ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے اسے کرنی پڑی کہ اس کے گناہ ہونے کا اسے احساس ہوا۔ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے۔ تو اس کو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر ہی کرتا ہے۔ اگر اس گناہ کے معاملے میں وہ اپنے نفس کو الاؤنس بھی دیتا ہے تو یہ بھی اپنی فطرت کے خلاف دیتا ہے اس لئے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو برائی ٹھہراتا اور اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ بروں کے ضمیر کو ٹٹولئے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اندر بھی احترام اور عزت نیکی ہی کے لئے ہے اگرچہ ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انسان نے جب سے معاشرتی واجتماعی زندگی کی کوئی شکل اختیار کی ہے اس کے اندر اس نے حق وانصاف کے قیام کے لئے لازماً ایک نظام بھی قائم کیا ہے۔ اگرچہ بسا اوقات بعض برائیوں نے معاشرے پر غلبہ پالیا ہے کہ نیکیاں ان کے نیچے دب گئی ہیں لیکن معاشرے کا مجموعی ضمیر اس پر کبھی راضی نہیں ہوا بلکہ اس کے اندر ایسے لوگ موجود رہے ہیں جنہوں نے معاشرے کے اندر وہی فریضہ انجام دیا ہے جو ہر صحیح الفطرت انسان کے اندر اس کا نفس لوامہ انجام دیتا ہے۔ اگر معاملہ اس حد سے گزر گیا ہے یعنی نیکی کی کوئی رمق سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے تو قانون قدرت نے اس معاشرے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔

چند سوال اور ان کے جواب: اب سوال یہ ہے کہ جب انسان خود اپنے ضمیر کے اندر ایک نگران رکھتا ہے جو اس سے صادر ہو جانے والی برائیوں پر اس کو ٹوکتا رہتا ہے، تو اس کے لئے یہ تصور کرنا کس طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک شتر بے مہار ہے، جس طرح کی زندگی وہ چاہے بسر کرے اور جس قدر چاہے اس نگران کی مخالفت کرے لیکن کوئی اس سے بازپرس کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ اگر انسان شتر بے مہار ہے تو یہ نفس لوامہ اس کے اندر کہاں سے آگھسا؟ اگر اس کا خالق لوگوں کی نیکی اور بدی دونوں سے بے تعلق ہے تو اس نے نیکی کی تحسین اور بدی پر سرزنش کے لئے انسان کے اندر یہ خلش کیوں اور کہاں سے ڈال دی؟ پھر یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب اس نے ہر انسان کے اندر یہ چھوٹی سی عدالت قائم کر رکھی ہے تو اس پورے عالم کے لئے وہ ایک ایسی عدالت کبریٰ کیوں نہ قائم کرے گا جو سارے عالم کے اعمال خیر و شر کا احتساب کرے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے؟

ان سوالوں پر جو شخص خواہشوں سے آزاد ہو کر غور کرے گا وہ ان کا یہی جواب دے گا کہ بے شک انسان کو اپنا وجود گواہ ہے کہ وہ خیر و شر کے شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے، وہ شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ اس کے لئے لازماً ایک پرسش کا دن آنے والا ہے جس میں اس کو اس کی بدیوں کی سزا ملے گی اگر اس نے یہ بدیاں کمائی ہوں گی اور نیکیوں کا صلہ ملے گا اگر اس نے نیکیاں کی ہوں گی۔ اسی دن کی یاد دہانی ہی کے لئے خالق نے اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ خود انسان کے نفس کے اندر رکھ دیا ہے تا کہ انسان اس سے غافل نہ رہے اور اگر کبھی غفلت ہو جائے تو خود اپنے نفس کے اندر جھانک کر اس کی تصویر دیکھ لے۔ یہی حقیقت حکماء اور عارفین نے یوں سمجھائی ہے کہ انسان ایک عالم اصغر ہے جس کے اندر اس عالم اکبر کا پورا عکس موجود ہے، اگر انسان اپنے کو صحیح طور پر پہچان لے تو وہ خدا اور آخرت سب کو پہچان لیتا ہے۔ سقراط کا مقولہ مشہور ہے کہ "اے انسان! تو اپنے کو پہچان!"

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ﴿٣﴾ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ﴿٤﴾

کیا انسان نے گمان کر رکھا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر پاویں گے! ہاں، ہم جمع کریں گے اس طرح کہ اس کے پور پور کو ٹھیک کر دیں گے۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

حقیقت سے فرار کے لیے منکرین قیامت کی سخن سازی: اگرچہ لفظ 'انسان' عام ہے لیکن روئے سخن قریش کے انہی منکرین قیامت کی طرف ہے جن کے شبہات پچھلی سورتوں میں زیر بحث آئے ہیں۔ ان سے اظہار بیزاری کے لیے بات عام لفظ سے فرما دی ہے۔ فرمایا کہ قیامت کو ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت تو ہر انسان کے اپنے اندر ہی موجود ہے۔ اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ لوگ یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ ان کے مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد ہم ان کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر پائیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ چیز ان کو بعید از امکان نظر آئی ہے اور اس بنا پر وہ اپنے ضمیر کی شہادت کے خلاف قیامت کو جھٹلا رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہم ان کی ہڈیوں کو صرف جمع ہی نہیں کریں گے بلکہ اس قدرت و کمال کے ساتھ جمع کریں گے کہ ان کے جوڑ جوڑ پور پور ٹھیک کر دیں گے۔ 'بنان' انگلیوں کے پور کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حقیر سے حقیر جزو بھی ایسا نہ ہو گا جس کے جمع کرنے اور جوڑنے سے ہم قاصر رہ جائیں۔ 'قٰدِرِيْنَ' حال واقع ہے 'نَجْمَعَ' کی ضمیر جمع سے۔

بَلۡ يُرِيدُ الۡإِنسَانُ لِيَفۡجُرَ أَمَامَهُۥ ﴿٥﴾

بلکہ انسان اپنے (ضمیر کے) آگے شرارت کرنا چاہتا ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی قیامت کا انکار اس بنا پر کہ ہڈیوں کو جمع کرنا ان کو بعید از امکان نظر آتا ہے محض حقیقت سے فرار کے لیے سخن سازی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی خواہشوں کے ایسے غلام بن چکے ہیں کہ ان کی پیروی میں وہ خدا کے مقرر کیے ہوئے محتسب کے سامنے شرارت کرنا چاہتے ہیں جو کہیں دور نہیں بلکہ خود ان کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی مثال اس چور کی ہے جو کوتوال کی موجودگی میں چوری کرے۔

'أَمَامَهٗ' کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ انسان اپنی آگے کی زندگی میں برابر اپنے گناہوں پر جما رہنا چاہتا ہے اس وجہ سے قیامت کے انکار کے لیے بہانے تلاش کرتا ہے لیکن یہ مطلب لینے میں نہ نفس لوامہ کی شہادت سے اس کا کوئی تعلق واضح ہوتا اور نہ اس میں انسان پر اس کے اس رویے کے خلاف کوئی حجت ہی قائم ہوتی۔ 'اپنے آگے' سے مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ انسان اپنے ضمیر اور اپنے نفس لوامہ کے روبرو، اس کی تذکیر و تنبیہ کے علی الرغم، شرارتیں کرنا چاہتا ہے۔ قیامت کی سب سے بڑی شہادت انسان کے نفس کے اندر ہی موجود ہے لیکن جو شخص خود اپنی تردید و تکذیب کے لیے اٹھ کھڑا ہو اس کا کیا علاج ہے!

اس میں دلیل کا پہلو یہ ہے کہ قیامت پر حجت قائم کرنے کے لیے تو انسان کا ضمیر ہی کافی ہے لیکن جو شخص 'دروغ گویم بروئے تو' کی جسارت کرنے پر تلا بیٹھا ہو اس کا منہ نہیں بند کیا جا سکتا۔

اس سے یہ بات بھی نکلی کہ جو شخص اپنے نفس لوامہ یا دوسرے لفظوں میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے روبرو برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس لیے کہ ضمیر درحقیقت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، خدا کا مقرر کردہ محتسب اور قاضی ہے تو جس نے اس کے آگے برائی کی اس نے خدا ہی کے آگے برائی کی۔

يَسۡأَلُ أَيَّانَ يَوۡمُ الۡقِيَامَةِ ﴿٦﴾

پوچھتا ہے قیامت کب ہو گی؟

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

ایک احمقانہ مطالبہ اور اس کا معتدل جواب: یہ منکرین قیامت کی جسارت اور ڈھٹائی کا بیان ہے کہ باوجودیکہ خدا کا محتسب خود ان کے اندر ہی موجود ہے اور وہ اس کو محسوس بھی کر رہے ہیں لیکن جب ان کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ قیامت کہاں ہے؟ وہ کب آئے گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! ہم اس کے ڈراوے سنتے سنتے تو تھک گئے لیکن اس کو نہ آنا تھا، نہ آئی تو اب ہم ان ڈراوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ اس کو لا کر ہمیں دکھائیں تو ہم اس کا حق مانیں گے۔ محض زبانی دھونس سے ہم ماننے والے نہیں ہیں۔

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴿٩﴾ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾

پس جب نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اور چاند گہنا جائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ تو اس وقت انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں!

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی آج تو وہ اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں گویا اس کے مقابلہ کے لیے ہر قسم کی تیاری کیے بیٹھے ہیں لیکن جب اس کی ہولناکی سے سابقہ پیش آئے گا تو کہیں گے، اب کہاں بھاگیں؟

قیامت کے دکھا دیے جانے کا مطالبہ چونکہ ایک بالکل ہی احمقانہ مطالبہ ہے اس وجہ سے اس سے تو یہاں تعرض نہیں کیا لیکن اس کی ہولناکی کے بعض پہلو ان کے سامنے رکھ دیے۔ فرمایا کہ اس دن نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی، چاند گہنا جائے گا، سورج اور چاند، جو آج اپنے الگ الگ مداروں میں گردش کر رہے ہیں، ان کی حد بندیاں ٹوٹ جائیں گی اور وہ آپس میں ٹکرا جائیں گے۔

یہ قیامت کے دن کے احوال ہیں جن کا تعلق تشابہات سے ہے۔ اس جہان میں ان کی اصل حقیقت کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں مقصود صرف یہ دکھانا ہے کہ جو دن ایسی ہلچل کا ہو گا کہ چاند اور سورج اپنے مداروں سے ہٹ کر ایک ہی مدار میں جا پڑیں گے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مطلب یہ ہے کہ اگر عقل کا کوئی شائبہ تمہارے اندر ہے تو اس سے پناہ مانگو اور اس کی آفتوں سے بچنے کی جو راہ دکھائی جا رہی ہے اس کو اختیار کرو نہ کہ اس کے لیے جلدی مچاؤ۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ یہاں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں وہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صرف اس کا ہلکا سا تصور دینے کے لیے بیان ہوئے ہیں اور یہ اس کے بے شمار احوال میں سے صرف چند ہیں۔ آگے اسی گروپ کی سورتوں میں اس کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے اور وہ بھی اس کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف چند ہی ہوں گے اس لیے کہ زبان ان کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾

ہر گز نہیں، کہیں پناہ نہیں! اس دن تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہو گا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یہ جواب ہو گا ان کے قول 'أَيْنَ الْمَفَرُّ' کا۔ یعنی وہ پکاریں گے کہ اب کہاں بھاگیں! ان کو جواب ملے گا کہ ہر گز نہیں، اب کوئی ٹھکانا اور بھاگنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف سب کا ٹھکانا ہو گا۔ دوسری تمام راہیں فرار کی اس دن بند ہو جائیں گی۔

يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿١٣﴾

اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

قیامت کی غایت: یہ مقصد بیان ہوا ہے اس دن کے آنے کا۔ فرمایا کہ اس دن ہر شخص کو آگاہ کیا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگاہ کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس دن اس کے سارے اعمال کے نتائج سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ دنیا کی زندگی میں جو بدیاں اس نے کمائیں وہ بھی اس کے سامنے آجائیں گی اور جن نیکیوں سے منہ موڑا ان کے نتائج بھی سامنے آجائیں گے۔ قرآن میں جا بجا یہ تصریح ہے کہ اس دن آخرت سے غافل رہنے والے اپنے سر پیٹیں گے کہ کاش! ہم نے آج کے دن کے لیے فلاں اور فلاں کام کر لیے ہوتے اور یہ بھی کہیں گے کہ کاش! ہم نے رسولوں کے انذار سے انحراف نہ کیا ہوتا بلکہ ان کی دعوت پر ایمان لائے ہوتے۔ 'قَدَّمَ' اور 'اَخَّرَ' کے الفاظ ان کے تمام اعمال بد اور ان کی ساری کوتاہیوں و کج رویوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آخرت کی فیروزمندی کے لیے انسان کو بہت سے نیک کام کرنے اور بہت سے برے کام چھوڑنے پڑتے ہیں لیکن جو لوگ آخرت سے غافل یا اس کے منکر ہوتے ہیں وہ ان کاموں سے تو غافل یا منحرف رہتے ہیں جو وہاں کے لیے زادراہ کا کام دینے والے ہیں اور جو باتیں آخرت میں تباہی کا باعث بننے والی ہوتی ہیں، ساری زندگی وہ انہی کا ذخیرہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس آیت میں ایسے ہی محروموں کے لیے تذکیر و تنبیہ ہے۔

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴿١٤﴾ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿١٥﴾

بلکہ انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے۔ اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے: یہ اسی بات کی وضاحت دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ' کے الفاظ میں فرمائی گئی ہے۔ وہاں مخالفین قیامت کے سوال 'يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ' کے تعلق سے کلام کا رخ تصویر قیامت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے بعد اصل سلسلۂ کلام پھر عود کر آیا اور بات پوری کر دی گئی۔ فرمایا کہ انسان قیامت سے گریز کے لیے کتنے ہی بہانے بنائے لیکن وہ اپنے نفس پر خود حجت اور گواہ ہے۔ 'بَصِيْرَةٌ عَلٰى نَفْسِهٖ' کے معنی ہوں گے 'شَاهِدٌ عَلٰى نَفْسِهٖ' (وہ اپنے اوپر خود گواہ ہے)۔ اس کی دلیل اوپر بیان ہو چکی ہے کہ انسان کے اندر اس کا نفس لوامہ قیامت کا شاہد ہے، اس کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے ہی ضمیر کے آئینے میں اس کی صورت دیکھ سکتا ہے۔

'مَعَاذِيْرَهٗ' جمع ہے 'مَعْذِرَةٌ' کی۔ یہ دراصل 'مَعَاذِرُ' ہے۔ اس میں 'ی' زیادہ ہو گئی ہے جس طرح 'مناکیر' میں زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کے معنی جھوٹے عذرات اور لاطائل بہانوں کے ہیں۔ عربی میں مثل ہے 'اَلمعَاذِرُ مکاذب' بعضوں نے اس کو 'معذار' کی جمع بتایا ہے جس کے معنی اہل یمن کی بولی میں پردہ کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے، اہل یمن کی بولی میں نہیں اترا ہے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ﴿١٦﴾ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿١٧﴾ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ﴿١٨﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿١٩﴾

اس کو جلدی سیکھ لینے کے لئے اس کے پڑھنے پر اپنی زبان کو جلدی نہ چلاؤ۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

آیات کا پس منظر: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخالفین کی جلد بازیوں اور ان کے نت نئے مطالبات کے مقابل میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر انذار عام کی جو بھاری ذمہ داری ڈالی تھی اس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ کے پاس واحد سہارا وحی الٰہی ہی کا سہارا تھا۔ آپ کی مثال محاذ پر مامور سپاہی کی تھی اور آپ کوئی بھی قدم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ مخالفین نے آپ کو زچ کرنے کے لئے طرح طرح کے اعتراضات و مطالبات پیش کر کے آپ کو پسپا کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کو زور صرف کر رہے تھے۔ اوپر ان کا ایک مطالبہ مذکور ہوا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جس قیامت سے ڈرا رہے ہو وہ کہاں ہے؟ اگر اس کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی؟ اسی طرح قرآن میں ان کا یہ مطالبہ بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو وہ پورا کا پورا بیک دفعہ کیوں نہیں نازل ہو جاتا۔ غرض ہر طرف سے آپ پر نئے نئے اعتراضات و سوالات کی بارش تھی اور ہر سوال کے اطمینان بخش جواب کے لئے آپ کو برابر وحی الٰہی کا انتظار رہتا۔ اسی سے آپ کے قلب کو قوت، آپ کی روح کو حیات تازہ، عقل کو رہنمائی اور ارادے کو ثبات و استحکام حاصل ہوتا۔ چنانچہ قرآن اور احادیث دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی حکمت الٰہی کے تحت وحی کے نزول اور جبریل امین علیہ السلام کی آمد میں کچھ زیادہ وقفہ ہو جاتا تو آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی جانب اٹھ جاتیں۔ اسی شوق و اضطراب کا اظہار آپ سے اس وقت بھی ہوتا جب جبریل امین علیہ السلام آپ پر وحی القاء فرماتے۔ آپ ایک پر شوق طالب کی طرح چاہتے کہ

جلد سے جلد ساری وحی سن لیں اور اس کو اچھی طرح محفوظ بھی کر لیں کہ مبادا اس ابر نیساں کا کوئی قطرہ ضائع ہو جائے۔ اس تمہید کو ذہن میں رکھ کر اب آیات پر غور فرمایئے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ – یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عجلت و بے قراری سے روکا گیا ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوتی جب وحی آتی۔ اگرچہ شوق و عجلت کا مضمون ادب کے پامال مضامین میں سے ہے لیکن اس عجلت و بے قراری کی تعبیر کون کر سکتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت طاری ہوتی ہو گی جب ایک طویل وقفہ کے انتظار کے بعد اور مخالفین کی ژاژ خائیوں کے طوفان کے اندر حضرت جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نامہ و پیام کے ساتھ نمودار ہوتے رہے ہوں گے۔ ایک بچہ بھوکا ہو اور ماں اس کو چھاتی سے لگائے تو وہ چاہتا ہے کہ ماں کی چھاتی کا سارا دودھ ایک ہی سانس میں سڑپ لے۔ صحرا کا مسافر پیاس سے تڑپ رہا ہو اور طویل انتظار کے بعد اس کو پانی کا ڈول مل جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ پورا ڈول ایک ہی دفعہ پیٹ میں انڈیل لینا چاہتا ہے۔ ایک فراق زدہ کو جدائی کی کٹھن گھڑیاں گزارنے کے بعد نامہ محبوب مل جائے تو وہ چاہے گا کہ ایک ہی نظر میں اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالے۔ اگرچہ یہ مثالیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ناقص ہیں، تاہم ان سے کچھ اندازہ اس شوق، اس عجلت اور اس اضطراب کا کیا جا سکتا ہے جن کا اظہار آپ کی طرف سے بے اختیارانہ اس وقت ہوتا رہا ہو گا جب آپ وحی سے مشرف ہوتے رہے ہوں گے۔

اس کا سبب ایک نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متعدد تھے۔ مثلاً

- یہ کہ آپ جس فریضہ منصبی پر مامور تھے اس کا سارا پروگرام اسی سے معلوم ہوتا تھا۔
- آپ کی عقلی، ایمانی اور روحانی زندگی کا تمام تر انحصار اسی پر تھا۔
- حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے رہنمائی اسی سے ملتی تھی۔
- دشمنوں کے نت نئے اعتراضات و مطالبات کے فیصلہ کن جوابات اسی کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے۔
- علم کا غیر معمولی شوق اور اس کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری کا صحیح احساس بھی اس کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔

ان میں سے ہر محرک ایک پاکیزہ محرک ہے لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہی تھا کہ قرآن جس تدریج سے نازل ہو رہا ہے اسی طرح نازل ہو۔ چنانچہ آپ کو بار بار اس معاملے میں صبر و انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سورہ طٰہ کی آیات ۱۱۴-۱۱۵ میں بھی آپ کو اسی طرح کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ وہاں ہم اس کے بعض خاص پہلوؤں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں بھی اصلاً اسی بات کا ذکر ہے، یہاں دلا دیا

گیا کہ آپ قرآن کی حفاظت وصیانت کی طرف سے بالکل مطمئن رہیں۔ اس کے جمع و ترتیب، اس کو سنانے، یاد کرانے اور اس کے محتاج وضاحت مقامات کی وضاحت کی ذمہ داری اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ جتنا جتنا قرآن اتر تا جائے اس پر آپ قناعت کریں۔ نہ اس کے اتارے جانے کے لئے کسی عجلت و اضطراب کا اظہار کریں، نہ اس کی حفاظت کے باب میں کسی تشویش میں مبتلا ہوں۔ ان باتوں کو اپنے رب پر چھوڑیں۔ ہر کام اپنے صحیح وقت پر، ٹھیک ٹھیک اللہ تعالی کی حکمت و مصلحت کے مطابق ہو گا۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ - یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشویش کو رفع فرمایا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ چونکہ ایک عظیم آسمانی خزانہ آپ کی تحویل میں دیا جارہا تھا اس وجہ سے قدرتی طور پر اس کو اپنی امانت میں لیتے ہوئے آپ ایک ایک لفظ کو اس طرح محفوظ کرنے کی کوشش کرتے کہ کوئی حرف ضائع نہ ہونے پائے۔ اللہ تعالی نے آپ کو اطمینان دلایا کہ اس کو محفوظ کرنے اور اس کو سنانے کی ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

قرآن کی جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت کا وعدہ: لفظ "جمع" یہاں ایک جامع لفظ ہے۔ اس سے مراد اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرونا بھی۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں، کس ترتیب سے آپ جمع کرائیں۔ چنانچہ اس رہنمائی کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ سورتوں میں، ان کے مواقع کی تعیین کے ساتھ، جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی۔

اس کے علاوہ مزید اہتمام اللہ تعالی نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تاکہ کسی سہو و نسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات مبارک کے آخری رمضان میں آپ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا، اسی کی طرف "قرآنہ" کے لفظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ' - یعنی تم اپنی طرف سے قرآن کے اتارے جانے کے لیے کوئی جلدی نہ کرو۔ یہ معاملہ اپنے رب پر چھوڑو۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جتنا چاہے گا نازل فرمائے گا اور اس کی حفاظت اور اس کے جمع و ترتیب کا اہتمام بھی فرمائے گا۔ تمہاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ ہم جتنا قرآن سنا چکیں اس کے سنانے کی پیروی کرو۔ اسی کو پڑھو، اسی پر عمل کرو اور اسی کی دعوت دو۔ جو لوگ پورے قرآن کو بیک دفعہ نازل کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کے مطالبہ کی کوئی پروا نہ کرو۔

'ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ'- اسی سلسلہ میں مزید اطمینان یہ بھی دلادیا کہ اگر قرآن کے کسی مقام میں کسی وضاحت کی ضرورت ہو گی تو اس کے باب میں بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی وضاحت کی ذمہ داری بھی ہمارے اوپر ہے۔ جب وقت آئے گا تو یہ کام بھی ہم کر دیں گے۔ یہ اشارہ ان آیات کی طرف ہے جو کسی سابق حکم کی توضیح و تبیین یا اس کے نسخ یا تکمیل کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان توضیحی آیات کی طرف ہم جگہ جگہ اشارہ کر چکے ہیں اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ ان کے بعد بالعموم 'کَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ' کے الفاظ سے قرآن نے یہ رہنمائی بھی دے دی ہے کہ یہ اسی وعدے کی تکمیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے 'اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَهٗ' کے الفاظ میں فرمایا ہے۔

استاذ امامؒ کے بعض افادات: ان آیات کے تحت استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بعض حصے بھی ہم نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

> "مفسرین کا خیال ہے کہ ان آیات میں جس عجلت کا ذکر ہے اس کا سبب آنحضرت ﷺ کا یہ اندیشہ تھا کہ مبادا قرآن کی کوئی بات ضائع ہو جائے۔ ہم کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے جس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔"
>
> "آنحضرت ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ محسوس فرماتے کہ یہ ایک عظیم ذمہ داری اور بہت بڑی امانت ہے جو آپ کے سپرد کی جارہی ہے، اس میں کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی یا اس کا ایک حرف بھی ضائع ہوا تو آپ کو اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ساتھ ہی آپ کو یہ تمنا بھی تھی کہ اس میں اضافہ ہو، شاید آپ کی قوم اس کے کسی حصہ کی برکت سے راہ یاب ہو جائے۔ معاملہ کے یہ دونوں ہی پہلو نہایت واضح تھے چنانچہ اس سورہ میں آپ کو جو تسلی دی گئی اس میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے۔"
>
> "قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اجمالاً اور تفصیلاً دونوں طرح فرمایا ہے مثلاً
>
> (وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ۙلَّا یَاۡتِیۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ط) حٰم السجدہ (42-41:41)
>
> اور یہ کتاب عزیز ہے جس میں باطل نہ اس کے آگے سے راہ پا سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔

دوسرے مقام میں ارشاد ہے:

(اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) الحجر (9:15)

ہم ہی نے اس یاددہانی کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

''ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں کسی کمی بیشی یا تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ یہ باتیں اس وعدۂ حفاظت کے منافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیتوں میں فرمایا ہے۔ چنانچہ اس امر پر پوری امت متفق ہے کہ قرآن بالکل محفوظ ہے۔ امامیہ کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ کہتے کہ قرآن کا کچھ حصہ غائب کر دیا گیا تو یہ بات ان کے اکابر علماء کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے۔ سید مرتضیٰ، شیخ الطائفہ محمد بن حسن طوسی، ابو علی طبری صاحب مجمع البیان، محمد بن علی بن بابویہ قمی، سب نے اس بے ہودہ خیال کی، پوری شدت کے ساتھ، تردید کی ہے۔ محمد بن علی بن بابویہ قمی کہتے ہیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو قرآن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا بعینہٖ وہی قرآن ہے جو مابین الدفتین امت کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ قرآن ایک حرف بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص ہم سے یہ منسوب کرتا ہے کہ ہم قرآن مجید کے اس سے زیادہ ہونے کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔ اس باب میں ان کے ہاں جو روایات ہیں، ان کے بارے میں سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ امامیہ اور حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے ان کے اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کا تمام تر مدار چند ضعیف روایات پر ہے جن کو یہ صحیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان روایات کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ان کی بنیاد پر ایک ایسی بات کا انکار کر دیا جائے جس کی صحت قطعیت سے ثابت ہے۔''

آیت زیر بحث سے مولانا علیہ الرحمۃ نے جو استنباط کیے ہیں وہ یہ ہیں:

- قرآن حضورؐ کی زندگی ہی میں جمع کر کے، ایک خاص ترتیب پر آپ کو سنا دیا گیا۔ اگر یہ وعدہ آپ کی وفات کے بعد پورا ہونے والا ہوتا تو آپ کو اس قراءت کی پیروی کا حکم نہ دیا جاتا، جیسا کہ دیا گیا ہے: 'فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ' (پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کرو)۔

- آپ کو حکم تھا کہ جمع قرآن کے بعد جس طرح آپ کو قرآن سنایا جائے اسی طرح آپ اس کو پڑھیں...........اس حکم کالازمی تقاضاہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کواس ترتیب کے مطابق قرآن سنایاہو جس پر اس کی آخری قراءت ہوئی۔ اور یہ ترتیب وہی ترتیب ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔ آخری قراءت کا اصل کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہوناضروری ہے۔
- یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس جمع وترتیب کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ باتیں بھی بیان فرمادیں جو تعمیم و تخصیص یا تخفیف و تکمیل کی نوعیت کی تھیں۔"

آگے مولانارحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"یہ ساری باتیں قرآن مجید سے ثابت ہیں اور ان کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی پوری پوری سورتیں لوگوں کو سناتے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اس خاص ترتیب پر آپ کو سنائی گئی ہوں۔ صحابہؓ اسی ترتیب پر قرآن سنتے، اس کو محفوظ کرتے اور اس کی پابندی کرتے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ آپ آیتوں کو مخصوص سورتوں میں، معین مقامات پر لکھواتے، اور صحابہؓ اس حکم کی تعمیل کرتے۔ پھر جب کوئی توضیحی آیت اترتی تو آپ اس کو بھی قرآن مجید میں اس کے معین مقام میں لکھواتے اور ان کے لکھوانے میں دو اصول ملحوظ رکھے جاتے: یا تو وہ ان آیات کے ساتھ ملادی جاتیں جن کی وہ تشریح کرتیں یا سورہ کے آخر میں رکھ دی جاتیں اگر ان کا تعلق سورہ کے مجموعی مضمون سے ہوتا۔"

"ان توضیحی آیات کی ایک اور نمایاں علامت بھی قرآن کے تدبر سے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ خود ان آیات کے اندر ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ توضیح و تشریح کے طور پر نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ان کے ساتھ بالعموم اس طرح کے الفاظ ہیں: 'كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ' (اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول رہاہے)۔"

"اسی طرح یہ بات بھی صحیح اور متفق علیہ روایات سے ثابت ہے کہ آخر میں حضرت جبریلؑ نے پورا قرآن، اس کی اصلی ترتیب کے مطابق آپ کو سنایا۔ اس سے نظام قرآن کے باب میں بہت سے شبہات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔"

(ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ)

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ﴿٢١﴾

ہر گز نہیں، بلکہ تم لوگ اس دنیا ہی سے عشق رکھتے ہو۔ اور آخرت کو نظر انداز کیے ہوئے ہو۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین کے بعد پھر کلام اپنے اصل سلسلہ سے جڑ گیا۔ مکذبین قیامت کو مخاطب کر کے فرمایا کہ قیامت کے بارے میں تمہارا یہ رویہ اس بنا پر نہیں ہے کہ اس کی کوئی دلیل تمہارے سامنے نہیں ہے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت تو خود تمہارے اپنے قلب و ضمیر ہی کے اندر موجود ہے۔ بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ تم دنیا اور اس کی مرغوبات سے عشق رکھتے ہو اور اس نقد کو چھوڑ کر آخرت کے نسیہ کے لیے بازی کھیلنے کا حوصلہ تمہارے اندر نہیں ہے۔

تکذیب قیامت کی اصل علت: 'تَذَرُونَ الْآخِرَةَ' کے معنی ہیں 'آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو'۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت تم سے مخفی نہیں ہے لیکن دنیا نقد ہے اس وجہ سے اس پر فریفتہ ہو اور آخرت نقد نہیں اس وجہ سے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رہے ہو۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿٢٤﴾ تَظُنُّ أَن يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿٢٥﴾

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی رحمت کے متوقع۔ اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے۔ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کمر توڑ دینے والی مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

اصل حقیقت: یعنی دنیا کے پیچھے آخرت کو نظر انداز کر رہے ہو تو کرو لیکن اس حقیقت کو نہ بھولو کہ جس کو نظر انداز کر رہے ہو وہ آ کے رہے گی اور اس دن صورت حال بالکل مختلف ہو گی۔ جنھوں نے اس کو سامنے رکھ کر زندگی گزاری ہو گی ان کے چہرے تو اس دن ترو تازہ اور شاداب ہوں گے، وہ اپنے رب کی رحمتوں کے متوقع ہوں گے اور جنھوں نے اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزاری ہو گی ان کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے اور وہ گمان کر رہے ہوں گے کہ ان پر کوئی کمر توڑ دینے والی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔

یہ جنت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے کے حالات کی تصویر ہے۔ مستحقین جنت جب دیکھیں گے کہ ہر قدم پر ملائکہ سلام و تحیت اور اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں تو اپنے روشن مستقبل کے تصور سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے اور وہ متوقع ہوں گے کہ اب رب کریم کی اس کامل رحمت و عنایت کے ظہور کا وقت آ گیا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس کفار کے ساتھ قدم قدم پر جس طرح کا معاملہ ہو گا اس سے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہوں گی۔ کہ اب اس کمر توڑ دینے والی مصیبت سے دوچار ہونے کا وقت آ گیا جس سے ان کو آگاہ کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو نظر انداز کیے رکھا۔

'إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ' کا صحیح مفہوم: 'اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ' کے معنی ہیں وہ اپنے رب کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہوں گے۔ 'نَظَرَ' کے بعد جب 'اِلٰی' کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی جس طرح کسی چیز کی طرف دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی کی رحمت و عنایت کے متوقع و منتظر ہونے کے بھی آتے ہیں۔ ماہرین لغت نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص سے، جس سے اس کو عنایت کی توقع ہو، یہ کہے کہ '**اِنَّمَا نَنْظُرُ الی اللّٰہ ثم الیک**' تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کے بعد آپ کی عنایت کے متوقع ہیں۔ (اقرب الموارد)

کلام کا سیاق و سباق بھی یہاں اسی معنی کے حق میں ہے۔ دوزخ میں جانے والوں کی ذہنی حالت و کیفیت 'تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔ یعنی وہ حالات دیکھ کر یہ گمان کر لیں گے کہ اب ایک کمر توڑ دینے والی مصیبت ان پر ٹوٹنے والی ہے۔ اور اس گمان کے سبب سے ان کے چہروں پر بدحواسی طاری ہو گی۔ ان کے اس گمان کے مقابل میں اہل ایمان کا حال یہ بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے رب کی سب سے بڑی رحمت کے ظہور کے متوقع ہوں گے اور اس توقع کے سبب سے ان کے چہرے کھلے ہوئے ہوں گے۔

'اَنْ یُّفْعَلَ بِھَا فَاقِرَۃٌ' کی تالیف زمخشریؒ نے یوں بیان کی ہے: '**ای یفعل بھا فعل ھو فی شدتھا فاقرہ**' (یعنی اس کو ایسی سزا ملنے والی ہے جس کی شدت کمر توڑ دینے والی ہے)۔ اگرچہ اس کے سوا بھی اس کی تالیف کی بعض صورتیں ممکن ہیں لیکن میں اس کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس کی بعض مثالیں آگے کی سورتوں میں آئیں گی۔

'فَاقِرَۃٌ' ایسی مصیبت کو کہتے ہیں جو ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑ دینے والی ہو۔

رویت باری کے مسئلہ میں ہمارا نقطۂ نظر: 'اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ' سے بعض لوگوں نے رویت باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک، جیسا کہ اس کی تاویل اور اس کے موقع و محل سے واضح ہے، یہ آیت اس مسئلہ سے تعلق رکھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ہی دوسرے موقع و محل کی آیت ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے رویت باری تعالیٰ کی مخالفت کی ہے اور اس مخالفت کے جوش میں 'اِلٰی' کے معنی ہی بدل دیے ہیں، ان کی رائے بھی ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔ رویت باری تعالیٰ کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں تو ہمارا ایمان، ایمان بالغیب ہے، ہم اپنے رب کو اس کی آیات اور نشانیوں کی اوٹ ہی سے دیکھ سکتے ہیں لیکن آخرت میں ہمارا ایمان بالمشاہدہ ہو گا اور ہر حقیقت کے باب میں ہمیں حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہو گا۔ رہا یہ سوال کہ اس مشاہدہ کی نوعیت کیا ہو گی تو اس کی حقیقت اس دنیا میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے اور متشابہات میں تعمق جائز نہیں ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہی جانتا ہے کہ اس مشاہدے کی نوعیت کیا ہو گی؟

كَلَّآ إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾

ہر گز نہیں، جب کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے گی۔ اور کہا جائے گا اب کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا! اور وہ گمان کرے گا کہ بس وقت چل چلاؤ کا ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہو گا۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

عیش دنیا کے متوالوں کو موت اور آخرت کی یاددہانی: عیش دنیا کے متوالوں کو یہ موت کی جان کنی اور اس وقت کی مایوسی و بے بسی کی یاددہانی ہے کہ قیامت کو بعید از امکان نہ سمجھو۔ وہ لازماً آئے گی اور تمہیں خدا کی طرف اس دن سفر کرنا ہو گا جب تمہاری ساری جولانیاں ختم ہو جائیں گی اور بے بسی کا یہ حال ہو گا کہ پنڈلی سے پنڈلی لپٹی ہوئی ہو گی۔ بہتر ہے کہ اس سے پہلے کہ جان ہنسلی میں آ پھنسے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ کے رہ جائے خدا کی طرف بھاگو اور اس سفر کے لیے کچھ سامان کر لو۔

فراہیؒ کے چند نکات: استاذ امام علیہ الرحمۃ نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح تحقیق پر مبنی ہے۔ ان کی تفسیر سے ہم اس کا ضروری خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

"'بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ' میں ضمیر نفس کے لیے ہے جو یہاں محذوف ہے۔ اس حذف کی مثال سورۂ واقعہ میں بھی ہے۔ فرمایا ہے: 'فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ' (الواقعہ 83:56) (کیوں نہیں جب کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے!) اس طرح کا حذف عربی میں معروف ہے اس وجہ سے 'نفس' کا ذکر ضروری نہیں ہوا۔ کلام عرب میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حاتم طائی کہتا ہے:

اماوی ما یغنی الثراء عن الفتی اذا حشرجت یوماً وضاق بها الصدر

(اے ماویہ! مال آدمی کے کیا کام آئے گا جب جان سینے میں پھنسے گی)

اس میں 'حشرجت' کا فاعل نفس ہے لیکن اسی قاعدے کے مطابق جو مذکور ہوا، اس کو حذف کر دیا۔ قرآن مجید میں بھی اس حذف کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً 'مَا تَرَكَ عَلَىٰ ظَهْرِهَا مِن دَابَّةٍ' (فاطر 45) (اور زمین کی پشت پر کوئی جاندار جیتا نہ چھوڑتا) اس میں دیکھ لیجیے ضمیر کا مرجع 'الارض' ہے جو محذوف ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

'وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ' (اور پکاریں گے، ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا!) یہ فقرہ صورت حال کی شدت و نزاکت کی تعبیر کے لیے ہے اور مجہول کا صیغہ یہاں غایت درجہ بلیغ ہے۔ گویا ایسا سخت وقت ہو گا کہ کوئی شخص قائل کی طرف توجہ کرنے والا نہیں ہو گا، یا یوں کہو کہ اس قول کی اہمیت خود قائل کی ذات سے بالکل بے پروا کر دے گی۔ ہر شخص

کی زبان پر بس یہی کلمہ ہو گا۔ نکرہ سے پہلے 'مَن' یا تو شدتِ طلب کے لیے آتا ہے یا غلبۂ یاس کی تعبیر کے لیے۔ طرفہ کا شعر ہے:

اذا القوم قالوا من فتی خلت اننی عنیت فلم اکسل ولم ابتلد

(جب قوم پکارتی ہے کہ ہے کوئی جوان! تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ ان کا اشارہ میری ہی طرف ہے، پھر میں کسی سستی اور بودے پن کا اظہار نہیں کرتا)۔

اب دیکھیے کہ یہاں آیت کا کیا منشا ہے اور یہ اسلوب کس مقصد کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں دو تاویلوں کا احتمال ہے اور ان دونوں میں فرق محض ظاہری ہے۔

پہلی تاویل یہ ہے کہ جب موت کی بے ہوشی طاری ہو گی اور جان سینے میں گھٹنے لگے گی تو تیماردار گھبرا کر پکاریں گے کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا جو اس جاں بلب کا علاج کرے!

دوسری تاویل یہ ہے کہ وہ کہیں گے کہ بس اب معاملہ آخر ہو چکا! اب کون اس کو شفا دے سکتا ہے! یہ اظہار یاس کا فقرہ ہے اور یہ سن کر مریض کو یقین ہو جائے گا کہ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مشہور شاعر خنساء نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

لکن سھام المنایا من یصبن لہ لم یشفہٖ طب ذی طب و لاراق

(جس کو موت کے تیر ترازو ہو گئے اس کو نہ کسی طبیب کی حذاقت شفا دے سکتی نہ کسی جھاڑ پھونک والے کی جھاڑ پھونک)

یہ دو تاویلیں ہو سکتی ہیں۔ ہم نے دونوں سامنے رکھ دی ہیں۔ جو چاہو اختیار کر سکتے ہو لیکن ہمارے نزدیک دوسری تاویل نظم کلام سے زیادہ لگتی ہوئی ہے۔"

'وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ' کی وضاحت کرتے ہوئے مولاناؒ لکھتے ہیں:

"پنڈلی سے پنڈلی لپٹنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی چل نہ سکے گا۔ یہ حالت شدت ضعف و بے بسی کے سبب سے ہو گی۔ آدمی جب تک زندہ اور طاقت ور ہے ہر میدان میں جولانیاں کرتا ہے۔ جب مر جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پنڈلیاں باہم دگر لپٹ گئی ہیں۔۔۔۔۔۔

ضعف و بے بسی کی تعبیر کے لیے التفاق ساق (پنڈلی کا لپٹ جانا) نہایت موزوں تعبیر ہے۔ مدعا کلام کا یہ ہے کہ جب معالج مریض سے مایوس، اعزہ و اقرباء دست بردار، فرماں بردار اعضاء قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ایک بھاری بوجھ کے ساتھ اس کو رب کی طرف جانا ہو گا، سہارا دینے والا کوئی نہ ہو گا، تو اس وقت اس کا کیا حال ہو گا؟

بعض لوگوں نے 'ساق' کے معنی 'شدت امر' کے لیے ہیں۔ لیکن یہ قول ان لوگوں کا ہے جن کو عربی زبان سے کوئی مس نہیں ہے۔ یہ لوگ اجزاء اور مجموعہ کی دلالت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ بلاشبہ 'کشف عن الساق' اپنی مجموعی صورت میں سرگرمی، مستعدی اور آمادگی کے مفہوم کے لیے عربی میں معروف ہے مگر جب یہ دونوں لفظ الگ الگ آئیں گے تو 'کشف' کے معنی کھولنے اور 'ساق' کے معنی پنڈلی کے ہوں گے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ الگ الگ بھی اسی مفہوم کو ادا کریں۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ 'ساق' سے مراد دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ روایت کرنے والوں کو کچھ وہم ہوا ہے۔ اگر روایت صحیح ہے تو اس کو بیان واقعہ سمجھنا چاہیے نہ کہ 'ساق' کی تفسیر۔"

"پنڈلی لپٹنے کا ٹھیک مطلب سمجھ لینے کے بعد 'اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمَسَاقُ' (اس دن تیرے رب کی طرف چلنا ہو گا) کا حسن موقع آپ سے آپ سمجھ میں آجاتا ہے۔ گویا اس سفر کی تیاریوں میں انسان سے جو غفلت ہوئی ہے یہ اس پر اس کو سرزنش ہے کہ وہ برابر دنیا ہی کی طلب میں سرگرداں رہا یہاں تک کہ اسی تگ و دو میں اس کی تمام

طاقت نچڑ گئی اور اس کو جانا ہے اپنے رب کے پاس تو وہ یہ سفر کس طرح طے کرے گا!" (ماخوذ از تفسیر سورۂ قیامہ مؤلفہ امام فراہیؒ)

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ﴿٣١﴾ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ ﴿٣٣﴾ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٤﴾ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ﴿٣٥﴾

پس اس نے نہ تو سچ مانا اور نہ نماز پڑھی۔ بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے۔ پھر افسوس ہے ، تجھ پر افسوس ہے!

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

سفر دشوار اور زاد و راحلہ کچھ نہیں: یہ ان مکذبین آخرت کی محرومی کا بیان ہے کہ سفر تو ان کو اتنا کٹھن در پیش ہے لیکن زاد و راحلہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے خدا کی راہ میں انفاق کیا نہ نماز پڑھی درآنحالیکہ یہی دو چیزیں اس سفر میں کام آنے والی تھیں۔

'صَدَّقَ' کے بعد 'بِالْحُسْنٰی' کا لفظ بربنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے۔ سورۂ لیل میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

('فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی o وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی o فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی') الیل(92 : 5-7)

پس جس نے اپنا مال راہ خدا میں دیا اور اپنے رب سے ڈرا اور آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی تو اس کو ہم سہج راہ چلائیں گے)۔

یہ امر واضح رہے کہ خدا کی راہ میں انفاق ان لوگوں کے لیے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے جو آخرت اور اس کی جزائے حسن کے قائل نہ ہوں۔ یہ گھاٹی وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جن کے دل مطمئن ہوں کہ دنیا میں جو کچھ وہ خرچ کریں گے آخرت میں ایک لازوال خزانہ کی صورت میں وہ ان کو ملنے والا ہے۔ آخرت کی جزا کا اعتقاد وہی ہے جو آدمی میں انفاق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، جو اس کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں ان کی مٹھی انفاق کے لیے کبھی نہیں کھلتی۔ سورۂ لیل کی مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ہی یہ حقیقت اس طرح واضح فرمائی گئی ہے:

(’وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى‘) اللیل(10-8 :92)

(رہا وہ جس نے بخیلی کی اور بے پرواہوا اور جزائے حسن کی تکذیب کی تو ہم اس کو ایک کٹھن راہ چلائیں گے)۔

ان آیات کی روشنی میں ’فَلَا صَدَّقَ‘ کا مفہوم یہ ہو گا کہ اس نے نہ آخرت کی جزائے حسن کی تصدیق کی اور نہ اپنے رب کی راہ میں خرچ کیا۔ گویا اس لفظ کے اندر تکذیب آخرت اور بخالت دونوں کا مفہوم مضمر ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ ’وَلَا صَلّٰى‘ (اور نہ اس نے نماز پڑھی) گویا انفاق اور نماز دونوں کا اصل محرک جزائے اعمال کا اعتقاد ہے اور جب یہ اعتقاد ہی معدوم ہے تو ان کے وجود پذیر ہونے کا کیا امکان باقی رہا۔

یہاں وہ بات بھی یاد رکھیے جس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہوتی آرہی ہے کہ نماز اور انفاق ہی دین کے وہ بنیادی اعمال ہیں جن پر پوری شریعت قائم ہے۔ اب اس آیت سے یہ حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ ان دونوں کا انحصار آدمی کے عقیدۂ آخرت پر ہے۔ جن کے اندر یہ عقیدہ محکم نہ ہو گا وہ ان کا اہتمام نہیں کر سکتے۔

’وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى‘۔ ’كَذَّبَ‘ یہاں ’صَدَّقَ‘ کے مقابل میں اور ’تَوَلّٰى‘ یہاں ’صَلّٰى‘ کے بالمقابل ہے۔ یعنی ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ رسول اور آخرت کی تصدیق کرتا اور خدا کی راہ میں انفاق کرتا۔ اور نماز پڑھتا لیکن اس نے تکذیب اور اعراض کی روش اختیار کی۔

اعراض کی تصویر اور اس کا سبب: ’ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى‘۔ یہ اس اعراض کی تصویر بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں اس کا سبب بھی بیان ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر مال و اولاد کا گھمنڈ ہوتا ہے ان کو خدا اور آخرت سے ڈرایا جائے تو یہ تذکیر ان پر کارگر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی رفاہیت و جمعیت کو اپنی روش کے صحیح اور کامیاب ہونے کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان لوگوں کی نصیحتیں خاطر میں نہیں لاتے جن ان کی ورش میں کسی غلطی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ وہ ان سے اثر پذیر ہونے کے بجائے اکڑتے ہوئے اپنے اہل و عیال کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب ہمیں یہ سب کچھ حاصل ہے تو یہ ہماری اقبال مندی کی دلیل ہوئی یا خرابی کی! خرابی ہمارے اندر نہیں بلکہ انھی لوگوں کے دماغوں کے اندر ہے جو خود تو ہر چیز سے محروم ہیں لیکن ہمیں ڈراوے سنا رہے ہیں کہ ہم تباہی کی راہ پر چل رہے ہیں۔

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو قرآن میں، مختلف اسلوبوں سے، بار بار بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کی روش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے اندر برابر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں کہ مبادا اس گلے کی نگہبانی کا حق ادا نہ ہو سکے اور وہ خدا کی کسی پکڑ میں آجائیں۔ اہل ایمان کے اس احساس ذمہ داری کا اظہار قرآن میں یوں ہوا ہے:

'اِنَّا كُنَّا قَبۡلُ فِيۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِيۡنَ' (الطور 52:26)

(ہم پہلے سے اپنے اہل و عیال کے باب میں ڈرنے والے رہے ہیں)۔

اس کے بالکل برعکس رویہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اہل و عیال کو اپنے لیے سرمایۂ فخر و نازش اور ان کو اپنی اقبال مندی کی دلیل سمجھتے ہیں اس وجہ سے ان کے دماغ پر وہی نشہ سوار ہوتا ہے جو سورۂ کہف میں ایک باغ والے کے قصہ میں بیان ہوا ہے کہ 'مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا' (الکہف 18:35) (میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ یہ کبھی تباہ ہو جائے گا)۔ اسی طرح کے لوگوں کی ذہنیت سورۂ مطففین میں بدیں الفاظ بیان ہوئی ہے:

'وَاِذَا انۡقَلَبُوۡۤا اِلٰۤى اَهۡلِهِمُ انۡقَلَبُوۡا فَكِهِيۡنَ' (المطففین 83:31)

(اور جب وہ اپنے اہل کی طرف لوٹتے ہیں تو مگن ہو کر لوٹتے ہیں)۔

'اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى ہ ثُمَّ اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى'۔ 'اَوۡلٰى' لفظ 'ویل' سے ہے جو زجر، اظہار حسرت و ملامت اور اظہار نفرت و غضب کے لیے آتا ہے۔ اس معنی میں یہ کلام عرب میں بکثرت آیا ہے۔ خنساء کا مشہور شعر ہے:

هممت بنفسی کل الهموم   فَاَوۡلٰى لنفسی اَوۡلٰى لها

(میں نے اپنے نفس کے بارے میں طرح طرح کے ارادے کر ڈالے۔ پس افسوس ہے میرے نفس پر، افسوس ہے!)

معلوم نہیں بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ سزاوار کس طرح کر دیا ہے۔ یہ عربیت کے بھی خلاف ہے اور سیاق و سباق سے بھی بے جوڑ ہے۔

اوپر سے کلام غائب کے اسلوب میں آرہا تھا، اس آیت میں اسلوب خطاب کا آگیا۔ اسلوب کی یہ تبدیلی افسوس اور نفرت کے اظہار میں شدت پر دلیل ہے۔ اس کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ﴿٣٨﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ﴿٣٩﴾ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ﴿٤٠﴾

انسان گمان رکھتا ہے کہ وہ بس یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ محض ٹپکائی ہوئی منی کی ایک بوند نہیں تھا؟ پھر وہ بنا خون کی ایک پھٹکی اور اللہ نے اس کا خاکہ بنایا اور اس کے نوک پلک سنوارے۔ پھر بنایا اس سے جوڑا، نر اور مادہ۔ کیا وہ خداوند قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

اب اسی مضمون پر سورہ کو ختم کر کے فرمایا ہے جس سے آغاز ہوا تھا۔ شروع میں فرمایا ہے: أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ۔ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ — اس کے بعد کلام انسان کی خود سری، دیدہ و دانستہ حق پوشی، اور ہول قیامت کے ذکر کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب آخر میں اسی سوال کو لے کر اس کا جواب دیا ہے کہ جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے پر تعجب کر رہے ہیں کیا وہ یہ گمان کئے بیٹھے ہیں کہ انسان غیر مسئول چھوڑ دیا جائے گا۔ اگر غیر مسئول چھوڑ دیا جانا خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے منافی ہے تو خدا کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کیوں مشکل ہو جائے گا؟ کیا وہ اپنی خلقت کے مراحل پر غور نہیں کرتے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے جو رحم میں ٹپکا دی جاتی ہے۔ ''يُمْنَىٰ'' مجہول کا صیغہ عدم اعتناء و اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ٹپکا دینے والا ایک بوند ٹپکا کر الگ ہو جاتا ہے پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ وہ بوند کہاں اور کس حال میں ہے۔ بعد کے سارے تصرفات اس پر قدرت کرتی ہے اور تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر وہ اپنی صنعت گری سے اس کو مختلف مراحل سے گزارتی ہے۔ پانی کی بوند خون کی ایک پھٹکی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ پھر اس کا خاکہ تیار ہوتا ہے۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے جاتے ہیں۔ بالآخر قدرت اس کو مرد یا عورت بنا کر وجود میں لاتی ہے۔ ان تمام مراحل میں قدرت کا موقلم ہی اس پر سارے تصرفات کرتا ہے۔ کسی اور کا ہاتھ اس میں شریک نہیں ہوتا۔ اب غور کرو کہ جس خدا نے اپنی قدرت، حکمت اور صنعت گری کی یہ شانیں تمہارے وجود کے اندر تمہیں مشاہدہ کرائی ہیں کیا وہ تمہارے مر جانے کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کر دینے پر قادر نہیں ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق بخشی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ و له الحمد فی الدنیا والآخرۃ۔

رحمان آباد

۱۹ جنوری ۱۹۷۹ء

۱۹ صفر ۱۳۹۹ھ

الانسان

((MAN, HUMAN))

31 آیات | مکّی

سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ۔۔۔القیٰمۃ ۔۔۔کی توام ہے۔سابق سورہ جس مضمون پر ختم ہوئی ہے اسی مضمون سے اس کا آغاز ہوا ہے۔اُ سکی آخری چار اور اس کی ابتدائی تین آیتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ دونوں نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ چیز توام سورتوں میں بالعموم نمایاں ہے۔اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

دونوں کا عمود بالکل ایک ہی ہے، البتہ نہج استدلال اور طریق بحث دونوں میں الگ الگ ہے۔پہلی میں قیامت کی دلیل انسان کے اندر نفس لوامہ کے وجود سے پیش کی گئی ہے اور اس میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر سمع و بصر کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور اس کو خیر و شر کے درمیان امتیاز کی جو قابلیت بخشی ہے اس کا بدیہی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں ان لوگوں کو داد ملے جنھوں نے ان اعلیٰ صلاحیتوں کا حق پہچانا اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہے اور وہ لوگ اپنے اندھے پن کی سزا بھگتیں جنھوں نے ان کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔اگر یہ جزا و سزا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ، العیاذ باللہ، شاکر اور کافر دونوں برابر ہیں۔

بعض مصاحف میں اس سورہ کو مدنی ظاہر کیا گیا ہے۔لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت کے بھی مدنی ہونے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے اصلی کسوٹی ان کے مطالب و مضامین ہیں۔آگے مطالب کا تجزیہ بھی آپ کے سامنے آئے گا اور آیات کی تفسیر بھی ان سے واضح ہو جائے گا کہ جن لوگوں نے اس کو مدنی خیال کیا ہے ان کے خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ میں مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(3-1) انسان کی خلقت سے متعلق اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کہ ایک دور اس پر ایسا گزرا ہے جب اس کی کوئی ہستی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عدم کی ظلمت سے نکالا اور وجود کی روشنی بخشی۔ پھر اس کی تخلیق کا سلسلہ پانی کی ایک بوند سے جاری فرمایا۔ اس بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے وہ اس درجے تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ سننے سمجھنے والی ہستی بن جاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو خیر و شر دونوں کے راستے دکھا کر اس کا امتحان کرتا ہے کہ وہ شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی۔

(22-4) خیر و شر کا امتیاز دے کر خالق نے انسان پر جو انعام فرمایا ہے اس کے لازمی تقاضے کا بیان۔ بالاجمال ان لوگوں کے انجام بد کی طرف اشارہ جو اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اس شرف کی ناقدری کر کے کفر کی راہ اختیار کریں گے۔ پھر اس عظیم صلہ کا بیان جس سے اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جنھوں نے اس کے انعام کی قدر کی اور اپنی زندگی جزا و سزا کو پیش نظر رکھ کر گزاری۔

(28-23) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کہ تم ناشکروں اور نابکاروں کے اعتراضات و مطالبات کی پروا نہ کرو۔ جس رب نے تمہارے اوپر قرآن نازل کیا ہے اس پر بھروسہ رکھو۔ وہ ہر مشکل آسان کر دے گا۔ حصول صبر و استقامت کے لیے نماز اور ذکر الٰہی کی تاکید اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ کفار کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ دنیا کے نقد عاجل کو آخرت کے نسیہ پر قربان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ اس بیماری پر پردہ ڈالے رکھے کے لیے وہ قیامت کے خلاف طرح طرح کے شبہات گھڑ رہے ہیں حالانکہ ان پر واضح ہے کہ تم جس چیز سے ان کو ڈرا رہے ہو وہ ایک

حقیقت ہے اور ہمارے لیے یہ ذرا مشکل نہیں ہے کہ جس طرح ہم نے ان کو پہلے پیدا کیا اسی طرح ان کے جوڑ بند ٹھیک کر کے دوبارہ اٹھا کھڑا کریں۔

(29-31) مخالفین کو تہدید کہ اللہ کا رسولؐ جو آگاہی تمھیں دے رہا ہے اس سے متعلق اس کی ذمہ داری صرف ان لوگوں کو آگاہ کر دینا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہارا اپنا کام ہے۔ رسولؐ یاددہانی کے بعد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔ قبول ہدایت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ایک معین سنت ہے۔ اس کے قبول کرنے والے تم میں سے وہی بنیں گے جو اس سنت کے تحت اس کے سزاوار ٹھہریں گے۔ جو اس کے سزاوار نہیں ہوں گے وہ اپنے کفر پر اڑے رہیں گے اور جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ﴿١﴾

کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت، زمانے میں، ایسا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا!

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

استفہامیہ اسلوب کی بلاغتیں: 'ھَلْ' کے معنی مفسرین نے استفہام کے بجائے عام طور پر 'قَدْ' کے لیے ہیں۔ لیکن کلام عرب میں اس معنی کے لیے مجھے کوئی نظیر نہیں ملی۔ بعض مثالیں جو اس معنی کی شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں ان پر میں نے غور کر لیا ہے۔ میرے نزدیک ان میں بھی 'ھَلْ' استفہام ہی کے لیے ہے۔ البتہ استفہام جس طرح ہماری زبان میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے اسی طرح عربی میں بھی اس کے مختلف مفہوم ہوتے ہیں۔ ان سب کی وضاحت کے لیے یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ پچھلی سورتوں میں اس کے بعض پہلو زیر بحث آ چکے ہیں اور بعض کے لیے آگے کی سورتوں میں موزوں مواقع آئیں گے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ استفہام کا ایک بلیغ موقع استعمال وہ بھی ہے جب مخاطب سے کسی ایسی بات کا اقرار کرانا ہو جس کی نوعیت ہو تو ایک بدیہی حقیقت کی لیکن مخاطب اس کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اس سے منحرف ہو۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ کوئی ماں اپنے نافرمان بیٹے سے یوں کہے کہ 'کیا تجھے یاد نہیں کہ تو ایک مضغہ' گوشت کی صورت میں میری گود میں ڈالا گیا تھا، میں نے اپنا خون دودھ بنا کر تجھ کو پلایا اور پال پوس کر جوان کیا'!

اس پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ محض ایک سادہ خبر یہ جملہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں۔ مثلاً

- اس میں بیٹے کو ایک عظیم حق کی یاد دہانی ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے اور جس سے اس کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس کا رویہ اس کے منافی ہے۔
- اس میں ملامت، غصہ، رنج اور اظہار حسرت کے بھی گوناگوں پہلو ہیں۔
- اس میں نہایت مبنی بر حقیقت گلہ و شکوہ بھی ہے اور نہایت مؤثر اپیل بھی۔

یہ سارے مفہوم اس استفہام ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو اس جملہ کے اندر ہے۔ اگر اس کو الگ کر کے جملہ کو سادہ خبریہ اسلوب میں کر دیجیے تو یہ تمام معانی ہوا ہو جائیں گے۔ بالکل یہی حال زیر بحث آیت کا بھی ہے۔ اس میں جو 'هَلْ' ہے اس کے اندر بہت سے معانی مضمر ہیں جو آگے مضمون کے تدریجی ارتقا سے کھلیں گے۔ اگر اس کو آپ 'قَدْ' سے بدل دیں تو یہ آیت ان مطالب کی تمہید کے لیے بالکل ناموزوں ہو جائے گی جو آگے آ رہے ہیں۔

معلقات کے ایک قصیدے کا مطلع ہے:

هل غادر الشعراء من متردم ۔۔۔۔ ام هل عرفت الدار بعد توهم

(کیا شاعروں نے شاعری میں کوئی خلا چھوڑ دیا تھا یا تجسس کے بعد تم نے منزل جاناں کا سراغ پا لیا ہے!!)

یہ ایک بہترین مطلع ہے اور اس کا سارا حسن اس کے خاص قسم کے اسفہامیہ اسلوب میں مضمر ہے۔ اگر اس 'هَلْ' کو 'قَدْ' سے بدل دیجیے تو یہ حسن بالکل غائب ہو جائے گا۔ شاعر خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھ رہا ہے کہ آج یہ قصیدہ کہنے کا ولولہ دل میں کیوں ابھرا ہے؟ کیا شاعری میں خلا رہ گیا تھا جس کو آج بھر دینے کا ارادہ ہے یا منزل جاناں کے آثار نے آتش عشق بھڑکا دی ہے جس کا حق ادا کرنا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں ہیں۔ شاعری میں بھی ایک بہت بڑا خلا رہ گیا تھا جس کو اس قصیدے سے پورا کرنا ہے اور منزل جاناں کے سراغ کا مضمون بھی اب تک کے شاعروں کی ساری خوں فشانیوں اور مضمون آفرینیوں کے باوجود ہنوز تشنہ ہی تھا، آج اس کا بھی حق ادا کر دینا ہے۔

یہاں اس مطلع کے محاسن کی وضاحت مقصود نہیں ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ اسلوب اور اسلوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ باعتبار وزن تو یہ شعر لفظ 'قَدْ' سے بھی پورا ہو جاتا لیکن معنی کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جاتی۔

آیت زیر بحث کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو قیامت اور جزاو سزا کے منکر تھے۔ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے یہ سوال ان کے سامنے رکھا ہے کہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایک وقت انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس کا وجود کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا بلکہ وہ پانی، کیچڑ، مٹی کے اندر رینگنے والی ایک حقیر مخلوق تھا۔ لیکن اسی حقیر مخلوق کو قدرت نے مختلف مراحل سے گزارا اور اس کی صلاحیتیں کو تربیت دے کر ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف بن گیا! اس سوال سے مقصود انسان کی قوت فکر کو حرکت میں لانا ہے کہ وہ سوچے کہ آخر قدرت نے اس پر یہ اہتمام کیوں صرف فرمایا؟ اس کو ان اعلیٰ صلاحیتوں سے کیوں نوازا؟ کیا محض اس لیے کہ وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے! کیا ان صلاحیتوں سے متعلق اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ کیا جس نے اس اہتمام سے اس کو وجود بخشا اس کا کوئی حق اس پر قائم نہیں ہوتا؟ یہ سوالات اس شخص کے اندر پیدا ہونے چاہییں جو اپنے وجود پر غور کرے۔

اپنا وجود انسان سے سب سے زیادہ قریب بھی ہے اور اس کی ہر چیز انسان کو دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ آیت کے استفہامیہ اسلوب نے اس حسن فکر کو بیدار کرنا چاہا ہے کہ انسان کی نظروں سے خدا اوجھل ہے تو اس کا اپنا وجود تو اوجھل نہیں ہے، وہ خود اپنے اندر خدا کی قدرت و حکمت اور اس کے عدل و رحمت کی نشانیاں دیکھ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ غور کرے تو یہ حقیقت بھی اس پر روشن ہو جائے گی کہ ہر چند اس نے قیامت ابھی دیکھی نہیں لیکن خود اس کے نفس کے اندر قیامت کے شواہد اور اس کے دلائل اتنے واضح ہیں کہ وہ ان کا انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہ بالکل ہٹ دھرم اور کج رو نہ ہو۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾

ہم نے انسان کو پیدا کیا ایک مخلوط بوند سے۔ اس کو الٹتے پلٹتے رہے یہاں تک کہ ہم نے اس کو دیکھنے سننے والا بنا دیا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

انسان کو مزید غور کی دعوت: اوپر کی آیت میں انسان کے اس تاریک ماضی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو زندگی کے نقطۂ آغاز سے تعلق رکھتا ہے۔ اب یہ اس کی پیدائش کے ان مختلف اطوار کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کا ہر پہلو اس کے سامنے ہے اور جو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت اشارہ کر رہی ہے کہ انسان پانی کی ایک بوند سے پیدا ہوتا ہے، اسی بوند کو مختلف اطوار و مراحل سے گزار کر قدرت اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ سننے سمجھنے اور عقل و ہوش رکھنے والے انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے؛

انسان غور کرے کہ جس خدا نے پانی کی ایک بوند پر اتنے عجیب کرشمے دکھائے ہیں کیا اس کے لیے اس کو دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہو جائے گا اور پھر اس بات پر بھی غور کرے کہ جس خدائے علیم و حکیم نے پانی کے ایک حقیر قطرے کو سمع و بصر کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا اور اس کو خیر و شر اور شکر و کفر میں امتیاز بخشا، کیا اس نے یہ ایک کارِ عبث کیا ہے کہ وہ باز پرس اور جزا و سزا کا کوئی دن نہیں لائے گا۔

'مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ' میں لفظ 'امشاج' جمع ہے 'مشج' اور 'مشیج' کی۔ اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ 'امشاج' اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوصف مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آتے ہیں۔ نطفہ کے مخلوط ہونے سے اس کا مختلف قویٰ و عناصر سے مرکب ہونا بھی مراد ہو سکتا ہے اور مرد و عورت کے نطفوں کا امتزاج بھی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں مختلف عناصر اور متضاد طبائع اور مزاجوں کا امتزاج ہو وہاں ان کے اندر ایسا اعتدال و توازن برقرار رکھنا کہ پیش نظر مقصد کے مطابق صالح نتیجہ برآمد ہو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ کام ایک حکیم و قدیر کی نگرانی میں ہو۔ کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر اس طرح کے حکیمانہ کام کا وقوع ممکن نہیں ہے۔

لفظ 'ابتلاء' کا مفہوم: 'نَّبۡتَلِيۡهِ' کو عام طور پر لوگوں نے بیان علت کے مفہوم میں لیا ہے۔ یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لام علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔

'ابتلاء' کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ اور ٹھونک بنا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔ اصحاب تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

انسان کی خلقت کے مختلف مراحل: انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبہ تکمیل تک پہنچی ہے ان کی وضاحت قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلاً ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ (الحج 22:5)

"اے لوگو، اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے باب میں شک میں ہو تو اس بات پر غور کرو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر پانی کی ایک بوند سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تمام اور کوئی ناتمام، تاکہ ہم تم پر اپنی قدرت و حکمت اچھی طرح ظاہر کر دیں۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔"

انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون میں یوں آئی ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَاماً فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْماً ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (المومنون 23:12-14)

"اور ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا پانی کی ایک بوند کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں۔ پھر ہم نے پانی کی اس بوند کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل ہی دوسری مخلوق کی صورت میں لا کھڑا کر دیا۔ پس بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والے، کی۔"

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف بالاجمال آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ 'نَبْتَلِيهِ' آیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچا پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہو گئی یا نہیں!

'فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعاً بَصِيْراً' یہ اس تمام اہتمام و تدبر کا خلاصہ سامنے رکھا ہے کہ یا تو انسان پانی، مٹی، کیچڑ اور نطفہ کی شکل میں بالکل 'لَمْ يَكُنْ شَيْءًا مَّذْكُوْرًا' (ناقابل ذکر چیز) کا مصداق تھا یا وہ دور آیات کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمع و بصر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ سورۂ مومنون کی محولہ بالا آیت میں اسی چیز کی طرف 'ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقاً آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

'سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ'۔ انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا اور کافر نعمت بن جاتا ہے۔ پھر اس سے لازماً یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جو اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر کریں وہ اس کا صلہ پائیں اور جو ان کی ناقدری کریں وہ اس کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس سارے اہتمام کا مقصد کیا جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیا!

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿٣﴾

ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

سمع و بصر کا ثمرہ: یہ انسان کو سمیع و بصیر بنانے کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ پھر ہم نے اس کو راہ سجھا دی۔ راہ سجھانے سے مراد یہ ہے کہ اس کو نیکی اور بدی کی راہ سجھا دی، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے : وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ –البلد: ۱۰- " اور ہم نے اس کو دونوں راہیں سجھا دیں۔" سورہ شمس میں فرمایا ہے: فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا – "پس اس کو اس کی بدی اور پرہیز گاری الہام کر دی۔" ان دونوں راہوں کے سجھا دیے جانے کے سبب سے انسان خود اپنے اوپر خیر اور شر کا گواہ بن گیا اور اس کے پاس بدی کی راہ اختیار کرنے کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا۔ اس حقیقت کی طرف سابق سورہ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۔وَلَوْ أَلْقَى مَعَاذِيرَهُ –القیمۃ: ۱۴-۱۵- "بلکہ انسان اپنے اوپر خود گواہ ہے اگر چہ وہ کتنے کی عذرات تراشے۔"

اختیار کی نعمت: إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا- یہ انسان کے اختیار وارادہ کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے اس کو نیکی و بدی کا امتیاز دے کر اس کو اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو نیکی کی راہ اختیار کرے، چاہے تو بدی کی راہ چلے۔ اگر نیکی کی راہ اختیار کرے گا تو وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنے گا اور اس کا انعام پائے گا اور اگر بدی کی راہ اپنائے گا تو وہ ناشکرا بنے گا اور اس کی سزا بھگتے گا۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلَاسِلَ وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا ﴿٤﴾

ہم نے کفر کرنے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

خیر و شر میں امتیاز کا لازمی نتیجہ: یہ خیر اور شر میں امتیاز بخشے جانے کا لازمی نتیجہ بیان ہوا ہے کہ جب اللہ تعالی نے انسان کو شکر و کفر دونوں کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت بخشی ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان لوگوں کو انعام سے نوازے جو شکر گزاری کی راہ اختیار کریں اور ان لوگوں کو سزا دے جو کفر کی راہ چلیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس صلاحیت کا دیا جانا لا حاصل رہا درآنحالیکہ اللہ تعالی حکیم ہے، اس کی شان حکمت سے یہ بعید ہے کہ وہ کوئی عبث کام کرے۔

کافروں کو سزا: فرمایا کہ چونکہ ہم نے انسان کو شکر اور کفر کا امتیاز بخشا ہے اس وجہ سے ہمارے ہاں شاکر اور کافر دونوں یکساں نہیں ہوں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ کریں گے۔ ناشکروں کے لئے ہم نے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ان کے پاوں میں زنجیریں پہنائی جائیں گی، گردنوں میں آہنی طوق ڈالے جائیں گے اور پھر ان کو گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِن كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ﴿٥﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ﴿٦﴾

ہاں، وفادار بندے ایسی شراب کے جام نوش کریں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہوگی۔ اس چشمہ سے اللہ کے خاص بندے پئیں گے اور اس کی شاخیں نکال لیں گے جدھر جدھر چاہیں گے۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

شکر گزاروں کو انعام: یہ کافروں کے مقابل میں شاکر بندوں کے صلہ کا بیان ہوا ہے اور ان کو 'ابرار' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس لفظ کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ 'برّ' کی اصل روح ایفائے عہد و ذمہ ہے اور لفظ 'شکر' کی اصل حیثیت نعمت کے حق کو پہچاننا اور اس کو ادا کرنا ہے۔ ان دونوں میں واضح قدر مشترک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اس کی نعمتوں کا حق پہچانتے اور اس کو ادا کرتے ہیں وہی دراصل اس کے وفادار بندے ہیں۔

لفظ 'كَأْسٌ' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جام شراب دونوں معنوں میں آتا ہے۔

'مِزَاجٌ' کے معنی ملونی کے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت، خوشبو یا ان کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے بعض چیزیں ان کے استعمال کے وقت ملائی جاتی ہیں۔ شراب میں بھی اس طرح کی ملونیوں اور بعض دوسرے لوازم کا ذکر عرب شعراء کرتے ہیں۔ اہل جنت کی شراب میں یہ ملونی چشمۂ کافور کے آبِ زلال کی ہو گی۔

'كَافُوْرٌ' سے مراد یہاں معروف کافور نہیں ہے۔ قرآن نے خود وضاحت فرما دی ہے کہ یہ جنت کا ایک چشمہ ہے جس کے کنارے بیٹھ کر اللہ کے خاص بندے شراب نوش کریں گے اور اس چشمہ کے پانی کی ملونی سے اس کے کیف و سرور کو دوچند کریں گے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا نام کافور کیوں رکھا گیا ہے تو ناموں سے متعلق اس طرح کا سوال اگرچہ پیدا نہیں ہوتا تاہم ذہن اس طرف جاتا ضرور ہے کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی مناسبت ہو گی۔ یہ مناسبت کس نوع کی ہے؟ اس کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت اسی دن اور انھی خاص بندوں پر کھلے گی جن کو اس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہو گی۔

لبِ جُو مے نوشی کا اہتمام: 'يَشْرَبُ بِهَا' میں 'ب' میرے نزدیک ظرفیہ ہے جس طرح 'يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ' اور 'يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ' میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چشمہ اللہ کے خاص بندوں کی بزم مے نوشی کے لیے مخصوص ہو گا۔ 'عباد اللہ' سے مراد وہی ابرار ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ انہی کو یہ خاص شرف حاصل ہو گا کہ ان کی مے نوشی کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مخصوص چشمہ کا بھی اہتمام فرمائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مے نوشی اور لبِ جُو میں بڑی مناسبت ہے۔

'یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا'۔ 'تَفْجِيْرٌ' کے معنی کسی چشمہ کی بہت سی شاخیں نکال نکال کر ان کے جال بچھا دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس چشمہ پر پہنچنے کے لیے اہل جنت کو کوئی شدِّ رحال نہیں کرنا پڑے گا بلکہ جو جہاں چاہے گا اس کی شاخیں نکال لے گا اور اس کی لذتوں اور اس کی سیر سے بغیر کسی زحمت سفر کے خوش وقت اور شاد کام ہو گا۔

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾

یہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے رہے ہیں جس کا ہول ہمہ گیر ہو گا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

ابرار کے وہ اعمال جن کے صلہ میں ان کو یہ سرفرازی حاصل ہو گی: یہ ان کے وہ اوصاف و اعمال بیان ہو رہے ہیں جن کے سبب سے ان کو رب کریم کی طرف سے یہ سرفرازی بخشی جائے گی۔

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو 'نذر' کہتے ہیں۔ ان وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں ایفائے نذر کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان نذروں کے پورے کرنے کا بھی اہتمام رکھیں گے جو انھوں نے بطور خود اپنے اوپر واجب کی ہوں ان سے نیکیوں کے بدرجۂ اولیٰ اہتمام کی توقع ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔ ہمارے مفسرین نے اس لفظ کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام نیکیوں پر حاوی کر دیا ہے، خواہ بندے نے اپنے اوپر وہ از خود عائد کی ہوں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔ لیکن یہ اس لفظ کے حقیقی مفہوم سے تجاوز ہے۔

اسلام سے پہلے نذر کی اہمیت: یہاں یہ امر یاد رکھیے کہ 'نذر' کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ جو لوگ کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتے، خواہ وہ حج و عمرہ کے قسم کی ہو یا قربانی و انفاق کے نوع کی، وہ اس کی نذر مانتے اور اہتمام سے اپنی نذر پوری کرتے۔ عربوں کے اندر اس کی وجہ زیادہ تر ان کی امیت تھی۔ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس وجہ سے ان کے اندر کے نیک لوگ نذروں کے ذریعہ سے اس خلا کو بھرتے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے تمام اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں وہ تو بالکل ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلیف مالایطاق نوعیت کی تھیں وہ بھی یا تو ممنوع قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب

شریعت کے احکام و آداب لوگوں کو تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا۔ بعد میں جب شریعت کا پورا ایثاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت محدود ہو گیا۔

خوف آخرت: 'وَيَخَافُونَ يَوْماً كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيْراً'۔ 'مُسْتَطِيْرٌ' کے معنی عام اور ہمہ گیر کے ہیں۔ یہ ان کے اندیشۂ آخرت کا بیان ہے کہ وہ ہمیشہ اس دن کی پکڑ سے ڈرتے رہے ہیں جس کی آفت عام و ہمہ گیر ہو گی۔ یعنی اس دن بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، راعی اور رعایا یہاں تک کہ عابد اور معبود سب کو اس کے ہول سے سابقہ پیش آئے گا۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴿٩﴾

اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے رہے ہیں۔ خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

غریبوں کی خدمت: یہ خلق کے ساتھ ان کے رویہ کا بیان ہے کہ وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کی ضرورتیں، خود اپنی ضرورتیں نظر انداز کر کے پوری کرتے ہیں۔ لفظ 'اِطْعَامٌ' محدود معنی میں نہیں ہے۔ زندگی کی دوسری ناگزیر ضروریات کا اہتمام بھی اس میں شامل ہے۔ قرآن میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

'عَلٰی حُبِّہٖ' میں ضمیر کا مرجع: 'عَلٰی حُبِّہٖ' میں ضمیر کا مرجع عام طور پر لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ وہ مسکینوں اور یتیموں کو اللہ کی محبت میں کھلاتے پہناتے ہیں۔ اگرچہ قاعدہ زبان کی رو سے اس میں کوئی خرابی نہیں ہے لیکن شواہد قرآن کے پہلو سے میں ان لوگوں کے قول کو ترجیح دیتا ہوں جو اس کا مرجع 'طعام' کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی ضرورت پر مسکینوں اور یتیموں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس قول کو ترجیح دینے کے مختلف وجوہ ہیں:

- ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ابرار کا کردار بیان ہو رہا ہے اور 'بر' یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری کا مقام حاصل کرنے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں وہ چیز خرچ کرے جو اس کو خود عزیز ہو۔ خواہ اس وجہ سے عزیز ہو کہ وہ

بذات خود قیمتی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ اس کا ضرورت مند ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ' (آل عمران 92:3) (تم اللہ کی وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو)۔ یہی حقیقت دوسرے لفظوں میں یوں واضح فرمائی گئی ہے :وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' (الحشر 9:59) (اور وہ اپنے اوپر غریبوں اور مسکینوں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

- دوسری وجہ یہ ہے کہ ان ابرار کا صلہ آگے آیت 12 میں بدیں الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا' (اور ان کو اللہ نے ان کے صبر کے صلہ میں جنت اور حریر سے نوازا)۔ یہاں غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی واحد چیز یہی ہے کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کو خود ضرورت مند ہونے کے باوجود کھلاتے پہناتے رہے ہیں۔ اگر 'عَلٰی حُبِّہٖ' کی تاویل اس سے مختلف کر دی جائے تو یہاں ان کے صبر کے کردار کو واضح کرنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی حالانکہ کلام اس کا مقتضی ہے۔ اس وضاحت نے 'عَلٰی حُبِّہٖ' کے ضمیر کا مرجع خود متعین کر دیا۔
- تیسری وجہ یہ ہے کہ جو انفاق عزیز و مطلوب مال میں سے، خود اپنی ضرورت کو قربان کر کے ہوتا ہے، درحقیقت وہی اللہ کی رضاجوئی کے لیے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے خدا کی محبت کا مضمون خود اس کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

اس آیت میں مسکین و یتیم کے ساتھ اسیر کا ذکر زمانۂ نزول کے حالات کے اعتبار سے ہوا ہے۔ اس زمانہ میں کسی جرم یا مطالبہ میں گرفتار قیدی عموماً اپنی مایحتاج لوگوں سے سوال کر کے پوری کرتے تھے۔ قاضی ابو یوسفؒ کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کے زمانے تک یہی حال رہا ہے۔ اب جیل کے نظام میں بڑی تبدیلیاں ہو گئی ہیں اس وجہ سے اس انفاق کی وہ اہمیت باقی نہیں رہی لیکن اب بھی قیدیوں اور ان کے متعلقین کی امداد کی ایسی بہت سی صورتیں ہیں جن میں انفاق اسی حکم میں ہو گا۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾

(اس جذبہ کے ساتھ کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں، نہ تم سے کسی بدلے کے طالب ہیں نہ شکریہ کے۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن سے اندیشہ ناک ہیں جو نہایت عبوس اور سخت ترش رو ہو گا

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

انفاق صرف اللہ کی رضاجوئی کے لیے: یہ ان کے اس انفاق کے باطنی محرک کا بیان ہے کہ وہ جس کی مدد کرتے ہیں نہ اس سے اپنے اس انفاق کا کوئی معاوضہ چاہتے نہ اس بات کے خواہش مند ہوتے کہ وہ ان کا ممنون احسان اور شکر گزار ہو بلکہ وہ صرف اپنے رب کی رضاجوئی اور آخرت کے خوف سے ایسا کرتے تھے۔

یوم آخرت کی صفت یہاں 'عَبُوس' اور 'قَمْطَرِیْر' آئی ہے۔ 'عَبُوس' کے معنی ترش رو اور دکھے پھیکے کے ہیں۔ 'قَمْطَرِیْر' اسی مضمون کی شدت کے اظہار کے لیے بطور تاکید آیا ہے یعنی وہ دن ایسا کھڑ، اکل کھرا اور ترش مزاج ہو گا کہ اس میں کوئی بھی کسی کے کچھ کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن سابقہ ہر ایک کو اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ خدا کی رحمت صرف انہی لوگوں کی طرف متوجہ ہو گی جنھوں نے اس کی رضاجوئی میں مسکینوں اور یتیموں کی سرپرستی اور ہمدردی کی ہو گی اور اپنی ضروریات نظر انداز کر کے ان کی احتیاج پوری کرنے پر اپنا مال صرف کیا ہو گا۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ بات وہ قولاً ہر اس شخص سے کہیں بھی جس کی مدد کریں بلکہ یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ان کے انفاق کے باطنی محرک کی تعبیر ہے کہ وہ جن حاجت مندوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں صرف للہ وفی اللہ خرچ کرتے، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت کے خوف کے سوا کوئی اور غرض ان کے سامنے نہیں ہوتی۔

فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾

تو اللہ نے ان کو اس دن کی آفت سے بچایا اور ان کو تازگی اور سرور سے نوازا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یہ ان کا صلہ بیان ہوا کہ چونکہ وہ اس 'عبوس' اور 'قمطریر' دن سے اندیشہ ناک رہے اور اس کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنا محبوب مال انھوں نے خرچ کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو اس کی آفتوں سے محفوظ رکھے گا اور اس دن جب سب کے چہرے اترے ہوئے ہوں گے ان کے چہرے ہشاش بشاش اور مسرور ہوں گے۔

وَجَزٰاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾

اور انھوں نے جو صبر کیا اس کے صلہ میں ان کو جنت اور ریشمیں لباس عطا فرمایا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت

صبر کی صفت کا صلہ: اور چونکہ انھوں نے صبر کیا اس وجہ سے ان کو جنت اور حریر کا صلہ عطا ہو گا۔ 'بِمَا صَبَرُوْا' سے اشارہ ان کے اس صبر کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر 'وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ خود بھوکے ہوتے ہوئے اپنے آگے کی رکابی دوسرے بھوکے کے آگے وہی سرکائے گا جس کے اندر صبر کی صفت ہو گی۔

'جنّت' ان کو اس لیے ملے گی کہ اس کے پھل کھائیں اور اس کے عیش دوام سے بہرہ مند ہوں اور 'حریر' اس لیے کہ اس کے لباس پہنیں۔ مکان، غذا اور لباس تینوں چیزیں اس کے اندر آ گئیں۔

مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾

ٹیک لگائے ہوں گے اس میں تختوں پر۔ نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

'سورج' اور 'زَمْهَرِيْر' نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے بالکل محفوظ، جنت کے تختوں پر براجمان ہوں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہو گی مگر اس میں حدت و تمازت نہ ہو گی۔ اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پر بہار رہے گا، خزاں کی نحوست اور باد زمہریر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ نہیں پیش آئے گا۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾

باغ جنت کے سائے ان پر جھکے ہوئے اور اس کے خوشے بالکل ان کے دست رس میں ہوں گے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی ان کے باغوں کے سائے ان کے سروں پر پھیلے ہوئے ہوں گے اور پھلوں کے خوشے اس طرح نکل رہے ہوں گے کہ بالکل ان کی دسترس کے اندر ہوں گے۔ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾

اور ان کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے۔ شیشے چاندی کے ہوں گے۔ ان کو انھوں نے نہایت موزوں اندازوں کے ساتھ سجایا ہو گا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی ان کے سامنے ہر وقت چاندی کے ظروف اور شیشے کے پیالے گردش میں ہوں گے اور یہ شیشہ بھی دیکھنے میں شیشہ ہو گا، حقیقت میں یہ بھی چاندی ہی کے جوہر سے بنا ہو گا۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم: 'قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا'۔ یعنی یہ ظروف اور پیالے مختلف شکلوں، مختلف پیمانوں اور الگ الگ اندازوں کے بنے ہوں گے اور خدام نے ان کو نہایت قرینہ اور حسن سلیقہ سے الگ الگ خانوں میں سجا کر رکھا ہو گا تاکہ حالات، وقت، ضرورت اور مطلوب شے کی مناسبت سے جس قسم کے سیٹ کی ضرورت ہو، پیش کر سکیں۔ لفظ 'تقدیر' ان تمام معانی پر حاوی ہے۔ اردو میں مجھے کوئی لفظ ایسا نہ مل سکا جو ان تمام کا احاطہ کر سکے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾

اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمۂ زنجبیل کی ہو گی۔ یہ اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

'زنجبیل' اور 'سلسبیل': اوپر چشمۂ کافور کا ذکر ہوا۔ یہ ایک دوسرے چشمہ کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ایک اور شراب بھی ان کی پلائی جائے گی جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ ہے جس کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ ناموں سے متعلق ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ ان میں مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ 'زنجبیل' کے مشہور معنی تو سونٹھ کے ہیں لیکن نام ادنیٰ مناسبت بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی کتنی ہی چیزوں کے نام قرآن میں مذکور ہیں لیکن ان ناموں سے ان کے مسمّٰی کی حقیقت کا صحیح علم ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ناموں سے آگاہ کر دیا۔

ان شاء اللہ ایک دن ان کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس چشمہ کا دوسرا نام 'سلسبیل' ہے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے جو اس کے گوناگوں اوصاف میں سے صرف ایک ہے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾

اور ان کی خدمت میں غلمان گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ ایک ہی سن پر رہیں گے۔ جب تم ان کو دیکھو گے تو ان کو بکھرے ہوئے موتی گمان کرو گے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

غلمان اور ان کے اوصاف: یہ ان کی خدمت اور ان کے آگے جام پیش کرنے والے غلمان کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ غلمان ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ 'مخلّد' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ اس وصف کے ذکر سے مقصود دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایک اس بات کی طرف کہ نوخیز چھوکرے ہوں گے اس وجہ سے خدمت میں نہایت چاک و چوبند، چست اور سرگرم ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے جس سے ان کی مستعدی بھی برابر قائم رہے گی اور اپنے مخدوموں کی خدمت میں برابر رہنے کے سبب سے ان کے مزاج، عادت اور ذوق سے بھی اچھی طرح آشنا ہوں گے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حسن خدمت میں تجربہ کو بڑا دخل ہے۔ بوڑھے خادم میں تجربہ ہوتا ہے لیکن اس کی مستعدی ختم ہو جاتی ہے۔ نئے خادم میں

مستعدی ہو سکتی ہے لیکن تجربہ اور ذوق سے نا آشنائی کے سبب سے آقا کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اہل جنت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے خدام مہیا کیے ہیں جن کی ہر خوبی دائمی ہو گی۔

'اِذَا رَاَیۡتَهُمۡ حَسِبۡتَهُمۡ لُؤۡلُؤًا مَّنۡثُوۡرًا'۔ یہ ان کے جمال، ان کی نظافت، ان کی خوش ادائی اور ان کی خوش لباسی کی تصویر ہے کہ جب تم ان کو دیکھو گے تو یہ گمان کرو گے کہ گویا ہر طرف موتی بکھرے ہوئے ہیں۔

وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾

جہاں دیکھو گے وہیں عظیم نعمت اور عظیم بادشاہی دیکھو گے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

یعنی جب دیکھو گے اور جہاں دیکھو گے وہیں ایک عظیم نعمت اور ایک عظیم بادشاہی کا جلوہ نظر آئے گا۔ گویا ہر قدم پر ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾

ان کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہو گا اور وہ چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب ان کو پاکیزہ مشروب پلائے گا۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

اہل جنت کا لباس: 'عَالِيَ' میرے نزدیک حال کے محل میں ہے اور مراد اس سے اہل جنت کے بالائی کپڑے ۔۔۔ عبا اور قبا وغیرہ ۔۔۔ ہیں۔

ان کے بالائی جامے سبز سندس اور استبرق کے ہوں گے۔ سندس اور استبرق ایران کے بنے ہوئے مشہور ریشمی کپڑوں کے نام تھے۔ بعض لوگوں نے ان دونوں کے درمیان باریک اور دبیز کا فرق کیا ہے لیکن یہ تحقیق غیر ضروری ہے۔ یہاں مراد جنت کے سندس اور استبرق ہیں جن کی اصل حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اہل عرب، ایران اور مصر ہی کے تمدن سے اس زمانہ میں زیادہ آشنا

تھے اس وجہ سے جنت کی نعمتوں کی تمثیل کے لیے زیادہ تر انہی کی تمدنی چیزوں کے نام مستعار لیے گئے۔ اس دور کے سلاطین سندس اور استبرق کی عبائیں زیب تن کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جن کے اوپر کے جامے سندس اور استبرق کے ہوں گے ان کے زیریں جامے اور بھی نرم ونازک ہوں گے۔ یہاں اہل جنت کے بالائی لباس کا تصور دے کر بات ختم کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے قیاس کر لو کہ اور وہ کیا کچھ پہنیں گے۔

اہل جنت کے ذوق کا لحاظ: 'وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ'۔ اس زمانے کے سلاطین سونے اور چاندی کے کنگن بھی پہنتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو چاندی کے کنگن بھی پہنائے جائیں گے۔ یہاں چاندی کے کنگنوں کا ذکر ہے۔ سورۂ کہف میں سونے کے کنگنوں کا ذکر ہے:

'يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ' (31)

(وہ اس میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سندس کے سبز لباس)۔

بعینہ یہی بات سورۂ حج آیت 23 اور سورۂ فاطر آیت 33 میں فرمائی گئی ہے۔ اس کی توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہ تنوع کے اظہار کے لیے ہے کہ اہل جنت جب چاہیں گے سونے کے کنگن پہنیں گے اور جن کا جی چاہے گا چاندی کے پہنیں گے۔ تنوع پسندی اور اختلاف مذاق ایک فطری چیز ہے جنت میں ہر شخص کے ذوق اور اس کے انتخاب کا پورا لحاظ ہو گا۔ 'لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ' (ق 35:50) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مفسرین نے عام طور پر یہی توجیہ کی ہے لیکن میرا ذہن ایک اور طرف بھی جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اہل جنت کے مراتب میں، جیسا کہ سورۂ واقعہ میں تفصیل سے آپ پڑھ چکے ہیں، فرق ہو گا۔ ایک گروہ سابقون اولون اور مقربین کا ہو گا۔ دوسرا طبقہ اصحاب یمین کا۔ ان دونوں طبقوں کی جنتوں اور نعمتوں میں فرق ایک قدرتی امر ہے۔ قرآن نے اس فرق کو واضح بھی کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس فرق کی بنا پر قرآن نے کہیں سونے کا ذکر کیا اور کہیں چاندی کا۔

ایک خاص نکتہ: 'وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا'۔ اس ٹکڑے میں بھی ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ اوپر آیت 5 میں ارشاد ہے:

'اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا'

(اللہ کے وفادار بندے ایک ایسی شراب میں سے پئیں گے جس میں چشمۂ کافور کی ملونی ہو گی)

اس کے بعد آیت 17 میں فرمایا:

'وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا'

(اور وہ اس میں ایک ایسا جام پلائے جائیں گے جس مین چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہو گی)

اور یہاں ارشاد ہوا کہ 'وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا' (اور ان کا پروردگار ان کو ایک شراب طہور پلائے گا)۔

عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں۔۔۔ 'يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَأْسٍ'، 'يُسْقَوْنَ كَأْسًا'، 'سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ' ۔۔۔ میں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں ہے؟ میری نزدیک یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ یہ ابرار درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خود رب کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا! یہ شراب طہور کیا ہے؟ اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمۂ کافور اور چشمۂ زنجبیل کے لیے اختیار فرمایا۔ اس کو صرف رب کریم ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اس مشک بو، مہر بند شراب خالص کی طرف اشارہ ہے جو مقربین کے لیے خاص ہے اور جس کا ذکر سورۂ مطففین میں نہایت اہتمام سے بدیں الفاظ ہوا ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ. (المطففین 86:25-28)

اور وہ مہر بند شراب خالص کے جام پلائے جائیں گے۔ اس کی مہر مشک کی ہو گی اور یہ ہے ایسی چیز کہ اس کی طلب میں طالبین باہم دگر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور اس میں ملونی چشمۂ تسنیم کی ہو گی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس پر مقربین خاص مے نوشی کریں گے۔

إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾

بے شک یہ تمہارے عمل کا صلہ ہے اور تمہاری سعی مقبول ہوئی!

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

رب کریم کی طرف سے داد: یعنی یہ سب کچھ پاکر پروردگار کی طرف سے ان کو یہ داد بھی ملے گی کہ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے، اللہ کے نزدیک تمہاری سعی مقبول ٹھہری! اس کے لیے تمہیں کسی دوسرے کی سعی و سفارش کا ممنون احسان نہیں ہونا پڑا۔ اس میں ان لوگوں پر ایک تعریض بھی ہے جو اپنے مزعومہ دیوتاؤں کی سفارشوں کے بل پر جزا اور سزا سے غافل رہے حالانکہ وقت پر ان میں سے کوئی بھی ان کے کام نہ آئے گا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾

ہم ہی نے تم پر قرآن نہایت اہتمام سے اتارا ہے۔اصلاحی تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور ان میں سے کسی گنہ گار یا ناشکرے کی بات کا دھیان نہ کرو۔

آیات کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

نبی صلعم کو صبر اور انتظار کی تلقین: جس محل میں سورۂ قیامہ میں آیت: 'لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ' (16) آئی ہے بعینہٖ اسی محل میں اور اسی مقصد سے اس سورہ میں یہ آیت ہے۔ یعنی منکرین اور مومنین کا انجام بیان کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر اور انتظار کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان لوگوں کے سامنے وہ سب کچھ آکے رہے گا جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے۔

'اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيْلاً'۔ یعنی یہ قرآن نہ تم نے اپنے جی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اور نہ اس کو تم نے ہم سے مانگ پر اپنے نازل کرایا ہے کہ اس کی پیش کردہ صداقتوں اور حقیقتوں کو ثابت کرنے اور لوگوں کو ان کے دکھا دینے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہو بلکہ یہ ہم ہیں جنھوں نے نہایت اہتمام سے اس کو تمہارے اوپر نازل کیا ہے۔ 'اِنَّا نَحْنُ' کے الفاظ میں جس

زور اور جس عظمت و جلالت کا اظہار ہے اس پر نظر رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے یہ قرآن تم پر اتارا ہے تو لوگوں کی مخالفتوں اور ان کی ژاژخائیوں کی پروا تم کیوں کرو! ان سے نمٹنے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے اور ہم سب سے نمٹ لینے کے لیے تنہا کافی ہیں۔

لفظ 'تَنزِیۡل' جس اہتمام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ قرآن نہ تو کسی سائل کی درخواست ہے اور نہ یہ کوئی ہوائی بات ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت سے یہ ہوا میں اڑ جائے بلکہ یہ نہایت اہتمام سے اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی کتاب ہے جس کی ہر بات پوری ہو کے رہے گی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

'فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعۡ مِنۡہُمۡ اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا'۔ 'فَاصۡبِرۡ' کے بعد 'ل' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں یہ انتظار کے مضمون پر متضمن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ کتاب تم نے مانگ کر اپنے اوپر نہیں اتروائی ہے تو لوگوں کے اعتراضات و مطالبات سے تم کیوں پریشان ہو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی ذمہ داری ہے وہ ادا کرتے رہو اور رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ ان نابکاروں اور ناہنجاروں کی ذرا پروا نہ کرو جو مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کو وہ عذاب دکھا دیا جائے جس سے قرآن ان کو ڈرا رہا ہے۔ لفظ 'اطاعت' یہاں پروا کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ آیت: 'کَلَّا لَا تُطِعۡہُ وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ' (العلق 19:96) میں بھی یہ اس معنی میں آیا ہے۔

'آثم' اور 'کفور' کی تحقیق: 'اٰثِمًا اَوۡ کَفُوۡرًا'۔ اوپر آیات 3 میں 'شاکر' اور 'کفور' کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ وہاں فرمایا ہے کہ 'اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا' (ہم نے انسان کو راہ دکھا دی ہے، چاہے وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا)۔

یہاں 'شاکر' کے ضد کی حیثیت سے لفظ 'اٰثِم' آیا ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہ لفظ حقوق تلف کرنے والے کے لیے آتا ہے۔ حقوق دو طرح کے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد، حقوق العباد تلف کرنے والوں کے لیے معروف لفظ 'اٰثِم' ہے اور حقوق اللہ نہ ادا کرنے والے کے لیے معروف 'کفور' ہے۔ اگرچہ یہ دونوں صفتیں لازم و ملزوم سی ہیں، جو حقوق العباد کا منکر ہو گا وہ حقوق اللہ ادا کرنے والا بھی نہیں بن سکتا، تاہم اشخاص کے رجحانات و میلانات کے اعتبار سے یہ بیماری ان کے اندر ذرا مختلف شکلوں میں نمایاں ہوتی ہے۔ بعض کے اندر خست، بخالت اور طمع مال، قساوت قلب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو نیکی کا دشمن بنا دیتی ہے۔ بعض کے اندر انانیت، خود پرستی اور استکبار پیدا ہو جاتا ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دیتا۔ قریش کے اندر ان دونوں کرداروں

کے نمونہ علی الترتیب ابولہب اور ابوجہل تھے۔ان دونوں طرح کے کرداروں کو سامنے رکھ کر یہاں 'وَلَا تُطِعۡ مِنۡهُمۡ اٰثِمًا أَوۡ كَفُورًا' کے الفاظ آئے ہیں۔اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ تمہارے مخالفوں میں دو طرح کے لوگ ہیں۔یا تو وہ طمع دنیا کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں اس وجہ سے تمہارے دشمن ہیں یا ان کے سروں پر انانیت کا بھوت سوار ہے جو ان کو حق کے آگے جھکنے نہیں دے رہا ہے اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی باتوں کو کوئی اہمیت دی جائے۔ان کا مرض لاعلاج ہے۔

وَاذۡكُرِ اسۡمَ رَبِّكَ بُكۡرَةً وَأَصِيلًا ﴿٢٥﴾ وَمِنَ اللَّيۡلِ فَاسۡجُدۡ لَهُ وَسَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيلًا ﴿٢٦﴾

اور صبح وشام اپنے رب کے نام کی یادرکھو۔اور رات میں بھی اس کو سجدہ اور اس کی تسبیح کرو، رات کے طویل حصہ میں۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

صبر کا نسخہ: اوپر جس صبر کی تلقین فرمائی ہے یہ اس کا نسخہ بتایا ہے کہ صبح وشام اپنے رب کے نام کو یاد رکھو۔صبح وشام احاطۂ وقت کے مفہوم میں بھی بولے جاتے ہیں اور لفظ 'ذکر' یہاں عام ہے جو نماز اور ذکر دوام دونوں پر شامل ہے۔'وَسَبِّحۡهُ لَيۡلًا طَوِيلًا' کے الفاظ سے تہجد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔خاص طور پر سورۂ مزمل کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیر بحث آئے ہیں۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الۡعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمۡ يَوۡمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾

یہ لوگ صرف دنیائے عاجل سے محبت رکھتے اور اپنے آگے ایک بھاری دن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

مخالفین کی اصل بیماری: یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے آپ کے مخالفین کی اصل بیماری کا پتا دیا ہے کہ یہ لوگ تمہارے انذار پر جو شبہات وارد کر رہے ہیں یہ محض اصل حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان کی سخن سازی ہے۔ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ اس دنیا کی لذت عاجل کے پرستار ہیں۔آخرت کی خاطر وہ اس نقد کو چھوڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔خواہ آخرت کا دن کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو

اپنی اس دنیا پرستی کو چھپائے رکھنے کے لیے وہ قیامت پر بعض بناوٹی قسم کے شبہات کا اظہار کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یہ تاثر دے سکیں کہ یہ لوگ تمہاری بات جو نہیں مان رہے ہیں تو اس کا سبب محض ضد اور انانیت نہیں بلکہ اس کے کچھ وجوہ ہیں۔

نَّحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾

ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ان کے جوڑ بند مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں گے ٹھیک انہی کے مانند بدل دیں گے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

مخالفین کو دھمکی اور ان کے شبہ کا جواب: یہ ان مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے اور اس میں قیامت پر ان کے سب سے بڑے شبہ کا جواب بھی ہے۔ ان کا سب سے بڑا شبہ، جو قرآن میں بار بار نقل ہوا ہے، یہی تھا کہ مرنے اور مٹی میں رَل مِل جانے کے بعد یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جائیں! فرمایا کہ ہم ہی نے ان کو پیدا کیا اور ہم نے ہی ان کے جوڑ بند اور رگ پٹھے مضبوط کیے تو جب ہم ہی نے یہ سب کچھ کیا ہے اور اس سے وہ انکار نہیں کر سکتے تو ہم جب چاہیں گے پھر ان کے رگ پٹھے از سر نو مضبوط کر کے ان کو اٹھا کھڑا کریں گے۔ جب پہلی بار ہم کو اس کام میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو وہی کام ہمارے لیے دوبارہ کیوں مشکل ہو جائے گا۔

'شدّ سرًا' کے معنی ہڈیوں اور اعصاب کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے جوڑنے کے ہیں۔ 'بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ' میں جس مثلیت کی طرف اشارہ ہے اس سے مراد یہی جوڑ بند از سر نو درست کرنے میں مشیت ہے۔

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٩﴾

یہ ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کر لے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

آگاہی اور اعلان بے نیازی: یہ ان لوگوں سے اظہار بے نیازی ہے کہ یہ آگاہی جو سنائی جارہی ہے محض ان لوگوں کی خیر خواہی کے لیے سنائی جارہی ہے۔ اس میں نہ اللہ کا کوئی نفع ہے اور نہ رسول کی کوئی ذاتی غرض اس میں مضمر ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کرکے اپنے رب کی راہ اختیار کرے ورنہ اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہے جس سے یہ کتاب آگاہ کررہی ہے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣١﴾

اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

آیت کی تفسیر اور الفاظ کی وضاحت:

توفیق ایمان کے باب میں سنت الٰہی: یہ اس سنت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے توفیق ایمان کے باب میں مقرر کر رکھی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ ہدایت کی توفیق انہی کو بخشتا ہے جو اپنے سمع و بصر سے کام لیتے اور خیر و شر، حق و باطل کے درمیان امتیاز کی اس صلاحیت کی قدر کرتے ہیں جو اس نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہے اور جس کی طرف آیات 3-2 میں اشارہ فرمایا ہے۔ رہے وہ لوگ جو اپنی یہ صلاحیتیں ضائع کرکے اندھے بہرے بن جاتے ہیں تو ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے لیے خدا نے جہنم تیار کر رکھی ہے اور اس جہنم میں وہ اس وجہ سے پڑیں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر خود ظلم کرکے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنایا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے۔ وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمدللہ علیٰ احسانہ

رحمان آباد

۱۳ فروری ۱۹۷۹ء

۱۵ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

Our other pages and blogs:

www.facebook.com/Dr.Muhammad.Hamidullah

www.facebook.com/Payam.e.Iqbal

www.ebooksland.blogspot.com

www. facebook.com/ye.Meri.dunyaa

پیام قرآن

The Message of Quran

www.facebook.com/payamequran